فہرست مضمون نگارانِ معارف

جلد ۱۳۰

ماہ جولائی ۱۹۸۲ء تا دسمبر ۱۹۸۳ء

(بہ ترتیب حروف تہجی)

شمار	اسمائے گرامی	صفحہ	شمار	اسمائے گرامی	صفحہ
۱۴	جناب عبدالرؤف خاں صاحب ٹونک کلاں راجستھان	۳۴۶	۱۷	پروفیسر ڈاکٹر محمد اسلم شعبۂ تاریخ پنجاب یونیورسٹی لاہور	۱۱۵، ۲۸۹
۱۵	پروفیسر عبدالمغنی شعبۂ انگریزی پٹنہ یونیورسٹی، پٹنہ	۴۲۴	۱۸	شیخ نذیر حسین صاحب مدیر اردو انسائیکلوپیڈیا آف اسلام لاہور	۳۹۳
[illegible]	ضیاء الرحمٰن پرواز اصلاحی	۳۹۸			
۱۷	جناب محمد اسد شہاب صاحب جدہ (سعودی عرب)	۵			

شعراء

آزاد، جناب جگن ناتھ آزاد (کشمیر) ۲۳۷

فہرست مضامین معارف

جلد ۱۳۰

ماہ جولائی ۱۹۸۲ء تا ماہ دسمبر ۱۹۸۲ء

به ترتیب حروف تہجی

شذرات

۲، ۸۲، ۱۶۲-۲۴۲، ۳۲۲-۴۰۲

مقالات

شمار	مضمون	صفحہ	شمار	مضمون	صفحہ
۱	اسلام اور مستشرقین پر دارالمصنفین کا بین الاقوامی سیمینار	۵۴-۱۳۶، ۲۱۹-۳۰۵	۴	الواح الصنادید	۱۱۵-۲۸۹
۲	اسلام اور مستشرقین پر دارالمصنفین کے بین الاقوامی سیمینار سے متعلق بعض اہل قلم کے تصورات،	۴۵۹	۵	امام ابوحفص بن شاہین بغدادی	۱۸۱-
۳	اسلام اور مستشرقین پر دارالمصنفین کے بین الاقوامی سیمینار کے متعلق پاکستانی اہل قلم کے تاثرات	۳۷۶	۶	پروفیسر اجناس گولڈزیہر	۸۵
			۷	تاریخ جہانگیر	۳۴۶
			۸	چند ادیبوں کے خطوط	
			۹	دیوان صلائی	۲۳۷
			۱۰	روسی استشراق	۵
			۱۱	سرسید کے خطوط: ایک مطالعہ	۴۰، ۹۷
			۱۲	سر ہملٹن الیگزنڈر گب	۲۶۲

جلد ۱۳۰ ماہ رمضان المبارک ۱۴۰۲ھ مطابق ماہ جولائی ۱۹۸۲ء عدد ۱

مضامین

شذرات

ان سطروں کو سپرد قلم کرتے وقت اسرائیل کے صہیونیوں نے لبنان کے پناہ گزین فلسطینی مسلمانوں پر اپنی ہلاکت آفریں بمباری سے جو انتہائی خوں ریز مظالم ڈھائے ہیں اس سے انسانیت کی گردن شرم و ندامت سے جھکی ہوئی ہے۔

یہودیت اپنے ازلی خبث نفس کے ساتھ پھر ایک بار نمودار ہو گئی ہے، انھوں نے فلسطینی مسلمانوں کو ان کے قدیم وطن فلسطین سے نکالا تو وہ مشرق وسطی کے مختلف ملکوں میں تقسیم ہو گئے، ان کی ایک بڑی تعداد لبنان میں پناہ گیر ہوئی، ان ہی پر اسرائیلی امریکہ کے مہلک اسلحہ سے حملے کر رہے ہیں جن میں اب تک بی بی سی کے بیان کے مطابق تیس ہزار فلسطینی شہید ہو چکے ہیں، ان کو دفن کرنے کے لیے جگہیں نہیں مل رہی ہیں، ایک ایک قبر میں بیس پچیس لاشیں دفن کی جا رہی ہیں، جو زندہ ہیں وہ اپنی جائے پناہ کو چھوڑ کر ادھر ادھر بھاگتے پھر رہے ہیں، ان کے کھانے پینے کے سامان پہونچنے کے راستے مسدود کر دیے گئے ہیں، بچے یتیم، عورتیں بیوہ، بوڑھے بے کس اور نوجوان بے سہارا بن کر اس مشہد اکبر کا منظر دیکھ رہے ہیں، عربوں کی غیرت، مسلمانوں کی ایمانی حرارت اور عام انسانوں کی حمیت اس خونخواری اور درندگی کے خلاف بروئے کار آنی چاہیے تھی مگر وہ صرف دور کے تماشائی بنے ہوئے ہیں کہ یہ بہادر فلسطینی خون میں نہا رہے ہیں، آگ میں جل رہے ہیں اور موت سے کھیل رہے ہیں۔

یہودی اور عیسائی مستشرقین مسلمانوں کی تاریخ کو قصائی کی دوکان کہنے میں نہیں شرماتے، لبنان مشرق ہی میں ہے، یہ اس وقت مذبح بنا ہوا ہے، امریکہ کے عیسائی صدر ریگن اور اسرائیل کے یہودی وزیر اعظم بیگن کی وجہ سے یہ خوں ریزی ہو رہی ہے، دور کے تماشائی ان دونوں کو بوچر کہہ رہے ہیں، اب دیکھنا یہ ہے کہ ان دو بوچروں کی تاریخ ہمارے مستشرقین اپنے قلم کے حسن کرشمہ سازی سے کس رنگ میں پیش کرتے ہیں، اس کو توریت اور انجیل کی عین تعلیم اور اس سفاکی کو غیر معمولی فتحمندی اور کامرانی قرار دیتے ہیں یا بہیمیت اور حیوانیت کی ایک انتہائی شرمناک مثال۔

اسرائیلی امریکہ کے سہارے عربوں کا خون جتنا چاہیں بہائیں، ان کو بار بار شکست کیوں نہ دیدیں اور وہ بالکل تباہ و برباد کیوں نہ ہو جائیں مگر وہ وہیں رہیں گے جہاں چودہ سو سال سے رہتے چلے آئے ہیں، لیکن تاریخ کہتی ہے کہ کبھی کوئی فاتح قوم ہمیشہ فاتح بن کر نہیں رہی، سکندر اعظم، سیزر، ہنیبال، نپولین، مسولینی اور ہٹلر کے سارے فاتحانہ کارنامے بھلا دیے گئے، ہر فاتح کو ایک دن شکست کا سامنا کرنا پڑتا ہے، اسرائیل کو بھی ایک دن شکست کھانی ہے پھر دور دور ملکوں سے آکر ریت کے ٹیلوں پر گھر بنانے والے یہودی ریگ صحرا کی طرح اڑتے نظر آئیں گے، اس وقت ان کا سہارا صرف امریکی اسلحہ ہے، جب کبھی بھی یہ روک دیے گئے تو ان کا وجود صفر بن کر رہ جائے گا۔

امریکہ اور لبنان کے عیسائی اس وقت یہودیوں کے طرفدار ہو گئے ہیں، لیکن ان عیسائیوں کو اپنی انجیل مقدس پر کچھ بھی اعتقاد ہے تو اسی میں یہودیوں کو خطا کار گروہ، بدکرداری سے لدی ہوئی قوم، بدکرداروں کی نسل، باغی، جھوٹے فرزند، خدا کی شریعت کو سننے سے انکار کرنے والا کہا گیا ہے (باب ۱ آیت ۴-۵، باب ۳۰ آیت ۹-۱۴) انجیل ہی میں ہے کہ یہودیوں نے حضرت سلیمانؑ کو شرک، بت پرستی، جادوگری اور زنا کے بدترین الزامات سے متہم کیا، انھوں نے حضرت داؤد پر اوریاہ کی بیوی سے زنا کرنے کا بھی الزام لگایا، یہی یہودی اپنی فطری سرشت سے فلسطینیوں پر جو چاہیں الزام رکھ کر ان پر قہر و ستم کا پہاڑ توڑ ڈالیں۔

مگر وہ مسلمان صحیح معنوں میں مسلمان نہیں جو یہ یقین کامل نہ رکھتا ہو کہ یہ یہودی ایک دن پہلے ہی کی طرح ذلیل و خوار ہو کر رہیں گے، وہ اپنی بدکرداری، خطاکاری اور جھوٹ کی وجہ سے ہزاروں برس سے خوار ہیں، ان کی خواری ان کی خونخواری سے دور نہیں ہو سکتی، اللہ تعالیٰ نے ان کے مغضوب ہونے کا فیصلہ کر لیا ہے، قرآن حکیم میں ہے کہ یہ یہودی جہاں بھی پائے گئے ان پر ذلت کی مار پڑی، لیکن اللہ کے ذمہ یا انسانوں کے ذمہ میں ان کو کبھی پناہ مل گئی تو یہ اور بات ہے (آل عمران ۱۲) اس وقت ان کو امریکہ کے اسلحہ کی وقتی پناہ ضرور مل گئی ہے لیکن قرآن حکیم ہی میں ہے کہ یہ اللہ کے غضب میں گھر چکے ہیں، ان پر محتاجی اور بے چارگی مسلط کر دی گئی ہے، اور یہ سب کچھ اس وجہ سے ہوا ہے کہ یہ اللہ کی آیات سے کفر

کرتے رہے، انھوں نے پیغمبروں کو ناحق قتل کیا، یہ ان کی نافرمانیوں اور زیادتیوں کا انجام ہے۔
(آل عمران ۱۲) قرآن حکیم میں یہ بھی پیشین گوئی ہے کہ تمہارے رب نے اعلان کردیا ہے کہ وہ قیامت تک برابر ایسے لوگ ان یہودیوں پر مسلط کرتا رہیگا جو ان کو بدترین عذاب دیں گے، یقیناً تمہارا رب سزا دینے میں تیز دست ہے (الاعراف ۲۰)
مسلمانوں کو اسی پر یقین کامل رکھنا ہے، اس میں شک نہیں کہ اس وقت یہودی خود فلسطینی مسلمانوں کو بدترین عذاب دے رہے ہیں اس کو فلسطینی مسلمان اپنی بداعمالیوں کی سزا سمجھیں، ایسی سزا صلیبی جنگ میں بھی مسلمان پاچکے ہیں بیت المقدس کی فتح کے بعد عیسائیوں نے اسی اندھے تعصب کا ثبوت دیا جو آج یہودی دے رہے ہیں، تاریخ یورپ کا مصنف اے۔ جی گرانٹ رقمطراز ہے کہ صلیبیوں کے نزدیک دشمن کو قتل کرنا خدا کی عبادت کے مساوی تھا، اسی لیے انھوں نے اپنے پوپ کو لکھ بھیجا کہ اگر آپ یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ ہم نے اپنے دشمنوں کے ساتھ کیا سلوک کیا تو اتنا لکھ دینا کافی ہے کہ جب ہمارے سپاہی حضرت سلیمانؑ کے معبد میں داخل ہوئے تو ان کے گھوڑوں کے گھٹنوں تک مسلمانوں کا خون تھا۔

صلیبیوں کی فتح اور مسلمانوں کی ناکامی کے اسباب کا تجزیہ کرتے ہوئے ایک انگریز مصنف لین پول نے لکھا تھا کہ اس وقت مسلمانوں میں ہر شخص ٹوٹے ہوئے تاج کے ٹکڑوں کے لیے دست و گریباں تھا، ایک ہمسایہ دوسرے ہمسایہ سے رشک رکھتا تھا، کوئی صاحب ہمت ان میں ایسا نہ تھا جو سب کا سردار اور ہادی بن کر دشمن سے لڑنے کو تیار ہوجاتا، یہی اسباب اس وقت یہودیوں کی کامرانی اور فلسطینیوں کی ناکامی کے ہیں، مگر جب مسلمانوں میں ان کی اصلی ایمانی حرارت اور ملی یکجہتی لوٹ آئی تو پھر عیسائیوں کی ساری متحدہ قوتیں بیکار ثابت ہوگئیں، بیت المقدس پر چار سو سال تک مسلمانوں کا قبضہ رہا، اب اس پر یہودیوں کا تسلط ہے، یہودی اپنی عارضی کامیابی پر جتنا خوش ہولیں، یہ صیہونی لڑائی صلیبی جنگ کی طرح برسوں جاری رہے گی، مسلمانوں میں جب کبھی ان کی ایمانی غیرت اور اخوی یگانگت اصلی معنوں میں عود کر آئے گی تو کوئی نورالدین زنگی اور کوئی صلاح الدین ایوبی پھر پیدا ہوکر رہے گا اور قرآن حکیم کی بشارت کے مطابق اللہ تعالیٰ ان یہودیوں پر ایسے لوگ ضرور مسلط کردے گا جو ان کو بدترین عذاب دیں گے۔

مقالات

روسی استشراق

از

جناب محمد اسد شہاب صاحب جدہ، سعودی عرب
مترجمہ مولوی عمیر الصدیق دریابادی ندوی۔ رفیق دارالمصنفین

جب استشراق اور مستشرق کے الفاظ کو مطلقاً بولا جاتا ہے تو ذہن مغربی یورپ اور امریکہ کے مستشرقین کی جانب منتقل ہوجاتا ہے۔ حالانکہ استشراق پر کسی قوم یا حکومت کی اجارہ داری نہیں ہے، مشرقی یورپ کی کمیونسٹ حکومتوں اور روس کا بھی اس میں نمایاں حصہ ہے۔ یہاں کے لوگوں نے اسلامی امور و مسائل کی جانب جس قدر اعتنا کیا ہے، وہ کسی طرح مغربی یورپ اور امریکہ کے مستشرقین سے کم نہیں ہے۔

بہت سے عرب اور مسلمان مصنفین نے یورپی استشراق و مستشرقین کے بارہ میں کتابیں لکھی ہیں، مگر روس یا مشرقی یورپ کے استشراق اور مستشرقین کے بارے میں بہت کم لکھا گیا ہے، اس مضمون میں روسی استشراق کی ابتدا اور نشو و نما کا ذکر کیا جائے گا۔

استشراق کا دائرۂ کار اور طریقۂ عمل جدا جدا ہوتا ہے، مگر اس کا خاص رخ اور مطمح نظر مخصوص مصالح و مقاصد پر مبنی ہوتا ہے، اس لیے اس کا معاملہ کبھی انفرادی اور کبھی اجتماعی ہوتا ہے، نیز کبھی

وہ کسی حکومت کے زیر سایہ اپنے فرائض انجام دیتا ہے، ایسی صورت میں اس کے لیے مخصوص بجٹ بنایا جاتا ہے اور وہ کبھی اپنی حکومت کی ملکی وسیاسی مصلحتوں سے بے تعلق نہیں رہتا۔

پہلے زار روس اور اب کیمونسٹ روس کی وسط ایشیا میں کئی نوآبادیاں ہیں جیسے ازبکستان، تاجکستان، قزاقستان، ترکستان، کرغیستان وغیرہ۔ یہ سب مسلم ریاستیں ہیں جن کی مجموعی آبادی ایک سو بیس (۱۲۰) ملین سے کم نہ ہوگی، یہ تمام ریاستیں معدنی ذخائر، پٹرول اور زرعی پیداوار سے مالا مال ہیں، موجودہ روسی سامراج کی اہمیت ان ہی زرخیز ریاستوں سے وابستہ ہے۔ اگر یہ اس کے قبضہ سے نکل جائیں تو پھر روس کا کوئی سیاسی وزن باقی نہیں رہ جائے گا۔

روس ایک سامراجی حکومت کی طرح ان ریاستوں پر حکومت کر رہا ہے، اس نے اپنی داخلی وخارجی سیاست کے استحکام کے لیے ان ریاستوں کو زیادہ اہمیت دینے کی پالیسی وضع کی ہے، اس لیے وہ ان ریاستوں کے مسلمانوں کی جانب خاص توجہ مبذول کیے ہوئے ہے، اور ان کے عقائد وافکار، تہذیب وثقافت اور جذبات ومیلانات کا بھی برابر مطالعہ کرتا رہتا ہے، تاکہ اس کی استعمار پر مبنی سیاست بھی مضبوط ومستحکم رہے اور کسی بیرونی یا اندرونی مسلم مداخلت کا بھی اندیشہ نہ رہے۔

روسی استشراق میں سیاسی مصالح کے تحت تغیر وتبدل بھی ہوتا رہتا ہے، تاکہ وہ اپنی ان وسیع وعریض اور شاداب وزرخیز نوآبادیوں سے بیش از بیش فائدہ اٹھاتا رہے، دراصل روس استشراق کے معاملہ میں وہی طریقہ اختیار کیے ہوئے ہے جس پر ہالینڈ گامزن رہ چکا ہے، اس بنا پر وہ اپنی تحقیق ومطالعہ اور علمی اداروں کو ایسے ناموں سے موسوم کرتا ہے جن سے اس کے اصل مقاصد پر پردہ پڑا رہتا ہے اور کہیں سے یہ گمان بھی نہیں ہوتا کہ ان علمی وتحقیقی کاموں کے پس پشت کچھ دوسرے اغراض بھی ہیں، ہالینڈ نے تو استشراق کا لفظ بھی باقی نہ رکھا اور اس کے بجائے "اسلامی امور کی کونسل کا دفتر" نام رکھ کر اپنی استشراقی سرگرمیاں جاری رکھیں، ناموں کے انتخاب میں روس نے بھی

اسی اصول کو اپنایا ہے، اس کے مختلف اداروں کے کچھ نام ملاحظہ ہوں:

(۱) معہد فنون شرقیۃ (انسٹی ٹیوٹ آف اورنٹیل آرٹس) (۲) مکتب شئون اسلامیۃ (آفس آف اسلامک افیرز) (۳) دار الافتاء (۴) مشرقی علوم کے ادارے (۵) جمعیۃ اتحاد العلوم (٦) روس عرب فرینڈشپ سوسائٹی (۷) معہد الدراسات العلیا للشئون الاسلامیۃ (انسٹی ٹیوٹ آف ہائر اسٹڈیز فار اسلامک افیرز) (۸) ادارہ دینیہ برائے امور اسلامی۔

اسی طرح کے خوبصورت اور جاذب نظر ناموں کے پردے میں مستشرقین اور اسلامی امور کے ماہرین اپنے کارنامے انجام دینے میں مصروف ہیں۔

۱۸۵۲ء میں زار روس نے روسی مستشرقین اور عربی زبان کے ماہرین کی ایک کمیٹی تشکیل دی جس کے بیشتر اراکین یہودی تھے، اس کمیٹی کا بنیادی اور اولین مقصد ان ضروری وسائل کی فراہمی تھا جن کے ذریعہ بیت المقدس کو آزاد کرایا جا سکے اور فلسطین میں یہودی مہاجرین کو آباد کرا کے روسی وفد کے زیر انتظام ان کے مریضوں کے لیے شفاخانے قائم کیے جائیں، اور روسی نمائندوں نے بیت المقدس کو اپنا مرکز یہ کہہ کر بنایا کہ وہ وہاں روسی گرجاگھروں کی دیکھ بھال کریں گے۔ کیونکہ وہاں ایسے مسیحی بھی تھے جو روسی آرتھوڈوکس مسلک کے پیرو تھے، نیز ان کے زیر نگرانی مختلف انسٹی ٹیوشن تھے۔

۱۸۶۴ء میں روس نے اس کمیٹی کے ممبروں کا ایک وفد خفیہ طور پر فلسطین بھیجا تاکہ یہ لوگ وہاں کے یتیم خانوں (آشرم) دواخانوں اور ان یہودی زائرین کی رہائش گاہوں کا جائزہ لیں جو دیوار گریہ کی زیارت کے لیے پوری دنیا سے وہاں آتے ہیں۔

۱۸۸۲ء میں یہ کمیٹی ایک خود مختار سوسائٹی میں تبدیل ہوگئی، اس کا ایک بنیادی ضابطۂ اصول بھی مرتب ہوا، اس طرح ارتقاء کا ایک مرحلہ طے ہوا۔ یہ تبدیلی محض نام کی تبدیلی نہیں تھی، بلکہ

اب دائرۂ کار بھی وسیع تر ہوا، اور ایک معینہ مدت میں اس سوسائٹی نے فلسطین اور بعض دوسرے عربی ممالک میں سو سے زیادہ اسکول قائم کر لیے، ان کے دروازے گو سب نو واردوں کے لیے کھلے تھے، لیکن اکثریت یہودیوں ہی کی تھی، ان اسکولوں کے نام قومی و وطنی ناموں پر تھے، ان میں زیر تعلیم طلبہ کی تعداد اس وقت دس ہزار سے بھی تجاوز کر گئی تھی۔

۱۸۸۲ء میں اس سوسائٹی نے سوسائٹی آف اسلامک اسٹڈیز کی حیثیت اختیار کر لی اور اپنا تعلق ماسکو یونیورسٹی کے شعبۂ اسلامیات (اسلامک اسٹڈیز) سے قائم کر لیا، سوسائٹی نے اس مقصد کے لیے ایک خاص علمی باڈی کی تشکیل کی، جس میں اسلامی تحقیق و مطالعہ سے شغف رکھنے اور عربی و اسلامی تاریخ و ادب سے دلچسپی رکھنے والوں کو شامل کیا گیا۔

۱۸۹۱ء میں اس سوسائٹی نے ارکیولوجک مشن (بعثت اثریہ) کے نام سے عرب ملکوں کی زیارت کے لیے ایک وفد بھیجا تاکہ یہ فلسطین میں قیام کر کے وہاں کے آثار قدیمہ کا جائزہ لے۔

اس وفد نے دمشق، بیروت، حمص، حلب، حماۃ، مشرقی طرابلس، بیت المقدس اور خلیل کا دورہ کیا، اور ایک لمبی مدت تک بیت المقدس میں ان آثار علمیہ کی تحقیق و مطالعہ میں مصروف رہا جن کا تعلق یہودیوں سے تھا، یہ یہودیوں کے قومی وطن کو منصۂ شہود پر لانے اور اسے تاریخی دلائل سے ثابت کرنے کی تمہید تھی، وفد اس موضوع پر اپنی مکمل رپورٹ اور دستاویزات کے ساتھ ماسکو واپس آیا اور آنے کے ساتھ ہی اس نے اسلامیات کے فضلاء و ماہرین کا ایک اجتماع کیا، اس میں روسی مستشرقین کی ایک سوسائٹی کی تجویز منظور کی گئی، اس سوسائٹی کو روس کی اکاڈمی آف سائنسز کا تعاون بھی حاصل ہوا، اس سوسائٹی میں مندرجۂ ذیل روسی مستشرق شریک ہوئے:

(۱) الف۔ ایس سیکوروف (۲) جے۔ جے کراسکوفسکی (۳) اے۔ این بوتیشف (۴) ایس۔ پی ٹالسٹوف (۵) الف۔ ایف میلونیسکایا، موخر الذکر دونوں حضرات اکاڈمی آف سائنسز کے بھی ممبر تھے۔

روسی مستشرقین کی یہ پہلی سوسائٹی تھی جو سرکاری طور پر اکاڈمی آف سائنسز کے تابع تھی، اس سوسائٹی کا پہلا خاص مقصد عرب ممالک اور عرب قوموں سے متعلق ہر ہر چیز کا مطالعہ تھا، اس کے بعد پھر مسلمانوں کا دینی، معاشرتی، ثقافتی، تاریخی اور اقتصادی جائزہ لینا تھا۔

اکاڈمی آف سائنسز کے اہم فرائض میں یہ بھی تھا کہ وہ علوم اسلامیہ کے خصوصی ماہرین کو تیار کرے، تاکہ وہ آیندہ روسی مستشرقین کی سوسائٹی میں داخل ہو سکیں اور ان کے اغراض و مقاصد میں ان کا ہاتھ بٹا سکیں۔

ان امور و مسائل پر روس نے جن مختلف اسباب و عوامل کی بنا پر اس قدر اہمیت دی ہے ان میں سے بعض یہ ہیں:

(۱) روس اور استنبول کی خلافت اسلامیہ کے درمیان پشتینی عداوت اور دیرینہ آویزش جس کی وجہ سے ترکی اور روس میں مسلسل جنگ برپا تھی۔

(۲) روس کی اپنی مقبوضہ مسلم ریاستوں کی جانب سے بغاوت کا خطرہ۔

(۳) روس کے توسیع پسندانہ عزائم جس نے اسے پڑوس کے دولت مند علاقوں کا حریص بنا دیا تھا، اور وہ بحر ابیض متوسط، خلیج عرب اور بحر عرب تک پہونچ جانے اور عالمی بحری گذرگاہوں پر قابو پانے کی فکر میں لگ گیا تھا۔

(۴) وسط ایشیا میں مسلمانوں کو دبائے رکھنا تاکہ وہ بغاوت نہ کر بیٹھیں۔

(۵) روسی سیاست کی طرف عالم اسلام کو متوجہ کر کے اس کے لیے ہمدردی اور تائید حاصل کرنا

ان اغراض کے پیش نظر روس نے عرب اور مسلمانوں سے متعلق ایک ایک چیز کی جانب اپنی توجہ مرکوز کی ہے۔

یہ سوسائٹی ۱۸۸۲ء میں قائم ہوئی تھی اس لیے اس نے ۱۹۷۲ء میں اپنے قیام کے نوّے برس گزر جانے کا جشن منایا

یہ جشن انسٹی ٹیوٹ آف اورینٹل اسٹڈیز کے مرکز میں یکم مئی کو منایا گیا، یکم مئی کو روسی مزدوروں کی عید کے دن کی حیثیت حاصل ہے، اس موقع پر مستشرق ایس۔ ایل۔ تیتنفسکی نے جو سوسائٹی کے صدر بھی تھے ایک جامع رپورٹ پیش کی جس میں اس سوسائٹی کی نوّے سالہ کارکردگی کا جائزہ لیا گیا تھا، اس رپورٹ میں جو چیز نہایت اہم ہے وہ اس بات کا اقرار ہے کہ اس سوسائٹی نے فلسطین میں یہودیوں کے تاریخی آثار کی حفاظت اور مرمت میں نمایاں خدمات انجام دیں، سوویٹ روس نے روسی مفاد کے پیش نظر معاشی ترقی میں عربوں کے ساتھ قربت اور ہم آہنگی میں جو پیش رفت کی، اس میں اس سوسائٹی کے کردار کو بھی اہمیت حاصل رہی، اس تقریب میں مستشرق کے۔ بی۔ اسٹارکوفا نے عالم اسلام کو اپنا موضوع بنایا، مستشرق ایم۔ اے کورسٹوفتسیف نے مصر میں قدیم فرعونی مذاہب اور توریت و زبور سے ان کا تعلق" کے موضوع پر مقالہ پڑھا، مستشرق ایل۔ وائی۔ ناری رادزی نے "عرب و روس تعلقات تاریخ اور واقعات کی روشنی میں" کے عنوان سے مقالہ پیش کیا۔

یہ سوسائٹی مختلف اوقات میں سیمناروں، کانفرنسوں اور کانگریسوں کا اہتمام کرتی رہتی ہے ان موقعوں پر پڑھے جانے والے تمام مقالات کی طباعت و اشاعت کا انتظام بھی اسی سوسائٹی کے ذریعہ ہوتا ہے۔

چند روسی مستشرقین کے نام اور عہدے

(۱) یوبو جان خوروف، ہیڈ آف دی انسٹیٹیوٹ ماسکو (۲) بوغولوف ماہر فقہ اسلامی (۳) یو۔ بی۔ کایا، ماہر ادب عربی (۴) کریز بیفیج، ڈائرکٹر انسٹی ٹیوٹ آف لینن گراڈ اور ماہر ادب عربی و تاریخ اسلامی (۵) خالیدوف، ماہر ادب عربی (۶) فرونفسٹ ماہر بلاغت و نحو (۷) میخائیلوف ماہر ادب عربی (۸) بیوتوفسکی، ماہر تاریخ یمن (۹) پوشاکوف، ماہر سیاست و معاشیات (۱۰) سیفسلافا ماہر ادب عربی و مذاہب (۱۱) بروودروف ماہر ادب عربی، مذاہب اسلامیہ و سیاسی تحریکات (۱۲) شوموسکی، ماہر جغرافیہ و علم البحار (۱۳) کلیموفش

ماہر فقہ و تاریخ اسلامی (۱۴) نشانوف، ماہر فقہ اسلامی (۱۵) کلیموفیتش سوسائٹی کے ترجمان کے مدیر اعلیٰ (۱۶) سیلیابیف، اسی ترجمان کے علمی مدیر (۱۷) اسلی نیفیا (۱۸) پایروسکایا (۱۹) نالیری ٹاریس، ادیب و نقاد (۲۰) الیکزنڈر سٹین ودلیپن فلسفی اور شاعر (۲۱) یوری نشین (۲۲) یوری غلاسوف عربی زبان کے ادیب و انشاپرداز (۲۳) یوری لسوف (۲۴) فلادیمیر میکسی موف، عربی زبان کے انشاپرداز (۲۵) اغناتی سیلیوف (۲۶) ایلینا گوسی (۲۷) غیا نکاریو فیتوریلی (۲۸) تحقیقنسکی صدر سوسائٹی (۲۹) کوردسفیتسیف، ماہر تاریخ عربی (۳۰) نادر ادیزی، علوم و تاریخ اسلامی کے پروفیسر (۳۱) سافاروف (۳۲) اسارکووا (۳۳) میخائیل بیڈروف (۳۴) گرگیوری سرباتوف۔

یہاں یہ ذکر کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ مستشرق میخائیل بیڈروف جو ایک یہودی الاصل اور صیہونی العقیدہ مستشرق ہیں اصل میں کون ہیں؟ یہ دوسری جنگ عظیم میں روسی فوج کے ایک کیپٹن تھے، بعد میں یہ چیکوسلواکیہ میں فوج کی تربیت دینے چلے گئے، دوسری جنگ عظیم کے بعد روس نے ان کو ایک عرب ملک میں اپنا سفیر مقرر کیا، یہ انتہائی متعصب صیہونی مستشرق ہیں روس سے یہودیوں کو فلسطین کی جانب منتقل کرنے کے پیچھے اصل دماغ انہی کا تھا، ۱۹۳۵ء میں انھوں نے "ارقون زوای لوبی" نامی ایک جماعت قائم کی جو بعد میں اسرائیلی فوج کا ایک حصہ بنی۔

ادارۂ اقوام ایشیا اس ادارہ کا مقصد بھی وہی ہے جو سوسائٹی کا ہے، البتہ یہ ادارہ ان تمام مقالات کو جو مستشرقین روس کا حاصل مطالعہ اور نتیجۂ تحقیق ہوتے ہیں جانچنے اور پرکھنے کے بعد کمیونسٹ پارٹی کی مجلس اعلیٰ کے سامنے پیش کرتا ہے، اور ان ہی مقالات کی روشنی میں عرب اور اسلامی ممالک کے بارے میں روس کی خارجہ پالیسی اپنا طریقۂ کار اختیار کرتی ہے، اس ادارہ کو نامور روسی مستشرقین کے تحت رکھا جاتا ہے، مثلاً انی بلیلیہ، فلاڈیمیر لوتسکی، گرگیوری سرباتوف، بورس دانیلینغ فلاڈیمیر تس بویکی، فرد ریکا فروٹیسا، اس ادارہ نے عرب ممالک سے متعلق چند کتابیں بھی شایع کی ہیں،

مثلاً سوریا و لبنان (۱۹۶۴ء)، جزیرۂ عرب و خلیج (۱۹۶۵ء)، لیبیا (۱۹۶۵ء)، عراق (۱۹۶۶ء)، مصر (۱۹۶۷ء)، ان کتابوں میں مذکورہ ممالک کا انتہائی تفصیل اور تحقیق سے جائزہ لیا گیا، اس جائزہ کی ابتداء ان ممالک میں اسلام کے داخلہ کے وقت سے ہی شروع ہوتی ہے، ان کتابوں میں مذہبی رجحانات، فقہی مسالک، عام عقائد، مذہبی اختلافات، لوگوں پر ان کے اثرات، حکومت اور سیاسی تعلقات پر ان مذہبی اختلافات کا اثر، حکومتوں کی خوبیاں اور خامیاں وغیرہ مباحث پر گفتگو کی گئی ہے، اسلامی حکومتوں کے کمزور پہلوؤں پر روس اپنی سیاست کو مرکوز کر دیتا ہے، مذہبی اختلافات کے پردہ میں روس کا یہ طرزِ عمل رہا ہے کہ وہ مذہبی جذبات اور دینی احساسات کو برانگیختہ کرنے والے پروگرام اس طرح مرتب کرتا ہے کہ مسلمانوں کے درمیان اختلافات کی آگ شدید ہو، یہ سب اس خوش اسلوبی سے انجام دیا جاتا ہے کہ مسلمانوں کو اس کی خبر تک نہیں ہو پاتی، باہمی اختلافات اور دشمنی بڑھنے کی وجہ سے روس کے لیے یہ آسان ہو جاتا ہے کہ وہ ایسے حلقوں میں اپنا اثر و رسوخ بڑھائے اور بزعمِ خود نئے انقلاب پسند طبقہ اور رجعت پسندوں کے مخالف افکار کو ان حلقوں کے فکر و عمل کی زینت بنائے۔

لینن گراڈ کا کتب خانہ

روس میں جتنے کتب خانے ہیں وہ سب استشراقی سوسائٹی سے تعاون کرتے ہیں، مشہور کتب خانوں میں لینن گراڈ کا کتب خانہ ہے یہ اسلامیات کے بارہ ۱۲ ہزار مخطوطات پر مشتمل ہے، خوش قسمتی سے یہ کتب خانہ کمیونسٹوں کے قبضہ کے وقت ان کے دست برد سے محفوظ رہا، اس سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ جب بربادی کے بعد اتنی بڑی تعداد محفوظ رہی تو وہ کس قدر نایاب اور وافر ذخیرۂ کتب رہا ہوگا جسے سپردِ آتش کر دیا گیا، مخطوطات کے علاوہ مطبوعات کی بھی ایک بڑی تعداد اس کتب خانہ میں ہے، جن میں عالمِ اسلام اور غیر عالمِ اسلام میں ہر زبان میں چھپنے والی کتابیں شامل ہیں، روسی قوم کو ان کتابوں کے مطالعہ کی اجازت نہیں ہے لیکن مستشرقین کو ان کتابوں سے مراجعت اور استفادہ کا حق حاصل ہے۔

مستشرق گریگوری سرباٹوف کے بیان کے مطابق تاشقند کے کتب خانہ میں اس وقت اسی ہزار اسلامی کتابیں ہیں جن میں مخطوطات اور مطبوعات دونوں شامل ہیں، یہ کتابیں عربی، فارسی اور ترکی زبانوں میں ہیں، صرف عربی کتابوں کی تعداد پندرہ ۱۵ ہزار سے کم نہیں، روسی مستشرقین کی محنت اور اسلامیات سے ان کے گہرے شغف کے نتیجہ میں سوسائٹی کی ازبکستان شاخ نے کئی اسلامی کتابوں کو ۱۹۴۵ء سے ۱۹۶۱ء تک روسی زبان میں منتقل کیا اور یہ عمل اب بھی جاری ہے،

مسلمانوں کے بارے میں روس کی پالیسی دوہری ہے، اندرون ملک مقبوضہ مسلم ریاستوں کے بارہ میں اس کا طرزِ عمل اس طرزِ عمل سے قطعی مختلف ہے جو وہ دوسرے مسلم ممالک کے ساتھ روا رکھتا ہے، اپنی مقبوضہ مسلم ریاستوں میں وہ تشدد اور بیخ کنی کا رویہ اپناتا ہے، لیکن ان اسلامی ممالک میں جہاں اس کا نفوذ اور غلبہ نہیں، وہ حکومتِ وقت کے خلاف ہر تحریک کی تائید کرتا ہے، تخریبی سرگرمیوں کی حوصلہ افزائی کرتا ہے اور اس کے ساتھ ہی اس موقع کو غنیمت سمجھتے ہوئے وہ ان تحریکوں کو مادی فلسفہ سے نہ صرف روشناس کراتا ہے بلکہ گرویدہ بھی بنا دیتا ہے، مذہبی اختلافی مسائل کو نمایاں کر کے وہ نئی نسل کو جو ان اختلافات کی سطحیت سے تنگ آ چکی ہوتی ہے، یہ باور کرانے میں کامیاب ہو جاتا ہے کہ اس قوم کے پرانے نظریات، قومی و وطنی مصلحتوں کے لیے ضرر رساں ہیں، اسلامی نظریات کو جامد اور بے جان ثابت کرنے کی کوشش کے بعد نئی نسل کے سامنے اشتراکیت اور سعادت کی ضامن قومیت کے دروازے کھول دیے جاتے ہیں، سوویت روس کی ایسی آماجگاہیں ایشیا اور افریقہ دونوں جگہ ہیں، روس کو یقین ہے کہ اپنے سارے امکانات اور وسائل کے ساتھ وہ اپنے مقاصد میں کامیاب ہوگا۔ ان سارے منصوبوں کی بنیاد دراصل انہی جائزوں پر ہوتی ہے جن کو روسی مستشرق پیش کرتے ہیں۔

خوبصورت اور شہد آگیں ناموں کے لیبل کے ساتھ سوسائٹی اپنے ان کاموں کو پیش کرتی ہے، مثلاً کلمۃ البحث العلمی، الدراسات التطبیقیۃ وغیرہ، علمی تحقیقات اور معروضی مطالعات کے یہ لیبل محض فریب کے لیے ہوتے ہیں، حقیقت میں یہ اسلامی قوموں کے لیے زہریلے اور خطرناک مواد سے پُر ہوتے ہیں، مثلاً مستشرق کلیمووِش کی کتاب جس کا نام "الاسلام نشوۂ و مستقبلہ" ہے اس میں ایک جگہ وہ لکھتے ہیں:

"قرآن کی وہ رائیں جو کائنات، زمین اور انسان کے بارہ میں ہیں، بالکل ابتدائی ہیں، اور سائنس کے منافی ہیں"۔

اس قسم کے بے بنیاد دعووں سے لبریز ان تحقیقات میں صرف الفاظ کی کھتونی ہوتی ہے، علمی متانت سے بے نیاز، استہزا، تحقیر، آسمانی مذاہب پہ بہتان اور عیب جوئی اور خردہ گیری کی کثرت ہوتی ہے، اور اسلامی شخصیتوں کے لیے صرف حقارت آمیز الفاظ ہوتے ہیں۔

روس کی اکاڈمی آف سائنسز نے مشرقی ادب کے مطالعہ میں تخصص کے لیے بھی ایک ادارہ قائم کیا ہے، اس ادارہ میں مشرق کے قصوں، کہانیوں، افسانوں، دیومالائی واقعات، قومی روایات اور فنون لطیفہ کا جائزہ لیا جاتا ہے، اس ادارہ کے ذمہ دار بھی مستشرق ہوتے ہیں، یہ ادارہ روسی مستشرقین کی تالیفات کو روسی مفاد کے مطابق ترکی، عربی، فارسی، ہندی، اردو اور چینی اور دوسری زبانوں میں شایع کرتا ہے، کبھی یہ بھی ہوتا ہے کہ کسی خاص ملک کے حالات کے مطابق صرف اسی ملک کی زبان میں وہ کتاب شایع کی جاتی ہے، دوسری زبانیں اس کتاب کی "قدر و قیمت" سے محروم رکھی جاتی ہیں، کلیمووچ کی کتاب جس کا ذکر اوپر آچکا ہے، اسی ادارہ نے شایع کی ہے۔

روسی استشراق کی سیاست منزل بہ منزل

روسی استشراق نے اپنے محدود منصوبوں میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد اپنی سرگرمیوں کو تیز تر کرنے کا پروگرام بنایا اور مختلف سیناروں، کانفرنسوں کے ذریعہ انھوں نے اپنی اشاعت کے نئے طریقے اپنائے، یہ سمینار وغیرہ وسط ایشیا کے شہروں میں خاص طور سے منعقد کرائے گئے کہ وہاں اسلام کا نام اب بھی باقی ہے۔

صدی کی ستر ویں دہائی میں ماسکو میں ایک عالمی مذاہب کانفرنس ہوئی، جس میں تمام مذاہب کی ممتاز شخصیتوں کو مدعو کیا گیا، مقصد یہی تھا کہ دنیا والوں کے سامنے خصوصاً ان لوگوں کے سامنے جو یہ کہتے ہیں کہ روس آسمانی مذاہب سے برسرپیکار ہے، یہ ثابت کیا جائے کہ روس مذاہب سے جنگ نہیں کرتا بلکہ وہ آسمانی مذہبوں کی حمایت کرتا ہے، جس کی دلیل یہ کانفرنس ہے، اس کانفرنس کے بعد تاشقند میں ایک اسلامی کانفرنس منعقد ہوئی، ۲۰۰۲ء میں ازبکستان میں مشہور مسلمان فلسفی فارابی کی یاد میں ایک بڑا جشن منایا گیا، ایک جشن ابن سینا کی یاد میں بھی منایا گیا، قزاقستان میں وسط ایشیا کے مسلمانوں کے دینی ادارہ کی تاسیس کے تیس سال گذر جانے پر بھی ایک جشن کا اہتمام ہوا، امام بخاری کی یاد میں بھی محفل جشن منعقد ہوئی، ان تمام جلسوں، کانفرنسوں اور سیمیناروں میں روس کی دعوت پہ عالم اسلام کی ممتاز اور مایۂ ناز شخصیتیں شریک ہوتی رہیں، سوسائٹی کی ہدایات پر عمل پیرا روس نے بعض مسلمانوں کا اعتبار بھی حاصل کر لیا تھا کہ اسلام، کمیونسٹ نظام حکومت کے سایۂ عاطفت میں خیروعافیت سے ہے، اور یہ کہ مسلمان روس میں آزاد و خود مختار ہیں، کانفرنسوں میں شریک ہونے والے مندوبوں سے بھی اس کی شہادت دلائی گئی، روس ان موقعوں پہ یہ بھی اعلان کرتا رہا کہ وہ اسلامی آثار و باقیات کی نگہبانی و حفاظت کر کے روس میں اسلام کا نام زندہ کیے ہوئے ہے، نیز وہ مساجد و مقابر کی مرمت میں کسی قسم کی کوتاہی نہیں کرتا، چنانچہ امام بخاری اور امام ترمذی کی قبروں کی دیکھ بھال بھی اس نے کرائی ہے۔

انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز کی طرف سے ایک ماہوار رسالہ "سائنس اور مذہب" کے نام سے شایع ہوتا ہے، اسے روسی مستشرقین کی اکثریت کا قلمی تعاون حاصل ہے، اس رسالہ کے پہلے شمارہ میں

اس اسلامی انسٹیٹیوٹ کے دستور و اغراض و مقاصد تحریر کیے گئے ہیں: (۱) مسلمانوں کے درمیان سے روحانی معنویت کو کمزور کرنا، ان کو ان کے عقائد سے دور کرنا اور ایسے افکار و نظریات کو نشو ونما دینا جو ان کے دین میں شک و شبہہ پیدا کر دیں۔ (۲) مسلمانوں میں دلکش مادی چیزوں کو خوبصورت اور جاذب اسلوب میں پیش کر کے فساد پیدا کرنا اور ایسی صورت حال پیدا کر دینا کہ وہ اشتراکیت کے حلقہ بگوش ہونے کے لیے خود بخود آمادہ ہو جائیں، ان دونوں مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے اس نے جو اسباب و وسائل اختیار کیے وہ مندرجۂ ذیل ہیں: اسلامی تعلیمات و نظریات کو قدیم، فرسودہ اور بوسیدہ ثابت کیا جائے، اور اس طرح یہ ظاہر کیا جائے کہ سائنس کے دور میں ان نظریات کا زمانہ کے قدم بہ قدم چلنا ممکن نہیں رہا، اشتراکی نظریہ اور اس کے مادی فلسفہ کی تائید میں خود مسلمان علماء و زعماء کے اقوال پیش کیے جائیں کہ تنہا یہی فلسفہ انسان کی خوشحالی کا ضامن ہے اور ان مذہبی اختلافات سے بچاتا ہے جو انسانیت کے لیے مضر اور مسلمانوں کو پسماندگی کی جانب لے جانے والے ہیں، اسلام سے پہلے کے تہذیبی ورثہ کا احیاء اس طرح کیا جائے کہ اس تہذیب پر فخر کیا جا سکے اور ہر اس شخص کی تائید کی جائے جو اسلام سے پہلے کے تہذیبی ورثہ کے احیاء کا کام کرتا ہو، ایسے مصنفین کی کتابیں خرید کر انھیں تقسیم کے لیے دوسری جگہوں میں بھیج دیا جائے۔

ان مقاصد اور ان وسائل کے ذریعہ مسلمانوں کی نئی نسلوں پر اپنا اثر و رسوخ قائم کرنے کی یہ روسی کوششیں کسی مزید تشریح کی محتاج نہیں، ایک روسی صحافی شار لوٹ ساکوسی کا بیان ہے کہ سوویٹ یونین نے سوسائٹی کی تجویز کے مطابق بیرون ملک کے اسلام پر کام کرنے والے غیر مسلم ریسرچ اسکالروں میں مفت تقسیم کرنے کے لیے تو قرآن مجید کے نسخے شایع کیے مگر خود روس کے اندر انھیں تقسیم نہیں کیا گیا، استاذ یوسف زراع لکھتے ہیں:

"اسلام کے بارے میں سوویٹ روس کی پالیسی دورخی ہے، اندرون ملک مکمل دشمنی اور بیرون ملک

وقتی دوستی، مثلاً تاشقند کے ایک اسلامی ادارہ نے ایک عمدہ کتاب شایع کی جو روس میں اسلام کی زندۂ جاوید یادگاروں کی رنگین تصویروں سے مزین تھی، یہ کتاب بیرون ملک کے ممتاز مسلمانوں میں تقسیم کی گئی، اس میں ایک مسجد اور مشہور مسلمان احمد یاسفی اور باشلیفان محمد کی قبروں کی تصویریں بھی شامل تھیں لیکن روس نے یہ ذکر نہیں کیا کہ یہ دونوں شاندار عمارتیں اب کمیونسٹوں کے لیے بطور ڈاک بنگلہ استعمال ہو رہی ہیں، روس میں پروپیگنڈہ کے لیے جو لٹریچر شایع کیا جاتا ہے وہ بجز چند استثنائی صورتوں کے اکثر روس میں ناپید ہوتا ہے، چنانچہ قرآن مجید کا ایک نہایت عمدہ اڈیشن شایع کیا گیا جو غیر ملکوں کے مسلمان فضلاء کے پاس تو بھیجا گیا مگر وہ خود روس میں عنقا ہی رہا[1]"

قرآن مجید کا یہ نسخہ باوجود تلاش بسیار کے ماسکو میں نہیں مل سکا، قرآن مجید کی طباعت و اشاعت ماسکو کے پروپیگنڈے کا محض ایک جزو تھا، قرآن مجید کے بارے میں روسی مستشرقین کے خیالات کا اندازہ اس قول سے لگایا جا سکتا ہے:

"قرآن اپنی ترکیب کے لحاظ سے ایک پیچیدہ کتاب ہے، جس میں عربوں، یہودیوں، عیسائیوں اور زرتشتیوں کے قصے اور دیومالائی کہانیاں بڑی تعداد میں بیان کی گئی ہیں، چنانچہ حضرت موسیٰ حضرت یوسف، یونس اور عیسیٰ مسیح وغیرہم کے قصے ہی اس کتاب کا بڑا جزو ہیں"

دانوکا: یہ ادارہ مطالعات آداب شرقیہ کے شعبہ کے ماتحت ہے، یہاں بھی ایشیا کے قصے کہانیوں، اساطیری روایات اور کلاسیکی ادب پر داد تحقیق دی جاتی ہے، اور عربی و اسلامی ادب پر بھی خاص طور پر عنایت کی نظر مرکوز کی گئی ہے، لینن گراڈ کے مستشرقین اس ادارہ کی دیکھ بھال کرتے ہیں،

[1] انتصار الاسلام ص ۴۹۔

۱۹۶۳ء کے بعد سے اس ادارہ نے کئی عربی وفارسی کتابوں کو روسی زبان میں منتقل کیا ہے، تونس، الجزائر، مصر، عراق بلکہ تمام عرب ممالک اور ہندوستان، افغانستان اور ایران کے اہل قلم کی ان کتابوں کو جن کا تعلق افسانہ، کہانی اور شاعری سے ہو، یہ ادارہ روسی زبان میں منتقل کرتا ہے، عرب مصنفوں میں احسان عبدالقدوس اور توفیق الحکیم کی کتابیں خاص طور سے روسی زبان میں منتقل ہوئی ہیں، ان کتابوں سے روسی مستشرقین اور استشراق نواز طلبہ نے بڑی رغبت کا اظہار کیا ہے، یہاں اس حقیقت کو فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ محض ان کتابوں کی علمی وفنی قدر وقیمت ہی ان کی مقبولیت کا سبب نہیں ہوتی، بلکہ ان کتابوں کے صفحات کے دریچوں سے جس معاشرہ کی جھلک نظر آتی ہے، افراد کے جو خط وخال سامنے آتے ہیں اور قوموں میں ان قصوں، کہانیوں اور اشعار کا جو ناگزیر اثر پڑتا ہے، وہ ان مستشرقین کے لیے خام مواد فراہم کرتا ہے، اسی پر روسی مطالعہ اور تجزیہ کا دارومدار ہوتا ہے۔

بیرونی کتابوں کی حوصلہ افزائی

یہ ادارہ بیرون ملک کے مصنفین کی ان کتابوں کو بہت اہمیت دیتا ہے جن میں اشتراکیت کی روح جلوہ گر ہو، مثال کے طور پر انڈونیشیا کے مارکسی ادیب پرامودیا اننتا تور کی کتابیں شایع ہوتے ہی مکتبوں سے چند مہینوں میں غائب ہو جاتی ہیں، اخباروں اور رسالوں میں ان کتابوں کی مقبولیت پر مضامین لکھے جاتے ہیں، ایک جائزہ کے مطابق یہ معلوم ہوا کہ روسی دائرۂ اثر کے تحت کام کرنے والا ایک ادارہ مکتبوں سے تمام کتابیں خرید لیتا ہے، پھر مؤلف وناشر کے علم کے بغیر جسے مناسب سمجھتا ہے ان کتابوں کو بطور ہدیہ پیش کرتا ہے، ظاہر ہے مؤلف کو اپنی کتابوں کی اس قدر مقبولیت پر فخر ہوتا ہے اور ناشر کو مزید اڈیشن شایع کرنے کا حوصلہ ملتا ہے اور اس طرح ماسکو کو ادبی دنیا کی فائدہ حاصل ہوتا ہے، اس قسم کی مثالیں دوسری زبانوں کی مطبوعات مثلاً سریانی، کردی، آرمینی، ترکی، عربی وغیرہ میں بھی ملتی ہیں۔

مسلم ممالک کے موجودہ اور مسلسل بحران پر اگر نظر ڈالی جائے تو صاف نظر آتا ہے کہ ہر واقعہ اپنے

پیش رو واقعہ سے جڑا ہوا ہے، اور واقعات کے اس تسلسل میں متعلقہ زبانوں کے رسائل اور اخبارات کا بڑا ہاتھ نظر آتا ہے جو قومیت، مقامی تہذیب اور قدیم تمدن کے تازہ خداؤں کی حمد وثنا کی دعوت دیتے ہیں، پاکستان میں بنگالی قومیت اور بنگلہ زبان پر حد سے زیادہ فخر کیا جاتا تھا، بالآخر بنگلہ تحریک کے زیر اثر بغاوت پھیلی اور ایک ملک دو نیم ہو گیا، عرب دنیا میں ہر عرب ملک اپنے محدود و مختصر خطۂ زمین کے گن گا رہا ہے اور ایک زبان، ایک ثقافت اور ایک تمدن ہونے کے باوجود ایک مکمل عربی اکائی کا وجود دشوار نظر آتا ہے۔

جب مسلمانوں میں کوئی رخنہ پیدا ہو یا کسی ترقی پذیر قوم میں کوئی دراڑ پڑ جائے اور یہ رخنے دینی عقائد ومسائل سے متعلق ہوں تو روسی مستشرقین کی نگاہ ان موقعوں کو منتخب کر لیتی ہے اور اپنا اثر دکھانے لگتی ہے۔

۱۹۵۱ء میں روسی مستشرقین کی ایک کانفرنس میں مستشرق سرکوف نے کہا تھا کہ ہماری حکومت کو چاہیے کہ وہ تیسری دنیا یعنی غیر وابستہ ممالک کے ساتھ اپنے تعلقات کو زیادہ اہمیت دے، ظاہر ہے تیسری دنیا کے اکثر ممالک اسلامی ہی ہیں، اور ہوا بھی یہی کہ روس نے اپنی ریشہ دوانیوں کے لیے سازگار ماحول اسی تیسری دنیا کا پایا۔

۱۹۶۹ء کی ایک کانفرنس

جنوری ۱۹۶۹ء میں اکاڈمی آف سائنسز کے زیر اہتمام روسی مستشرقین کی ایک اہم کانفرنس ماسکو میں منعقد ہوئی، اس کا موضوع "دینی نفسیات" تھا، اس میں عالم نفسیات مستشرق بلاٹونوف نے کہا:

"تدین (مذہب پرستی) کے نفسیاتی مظاہر میں کسی بھی منظر کی کوئی بنیاد نہیں ہے، یہ فرد کی ذاتیات بالا ہمی کے حتمی نتیجہ کی صورت میں نمو پاتا ہے، مذہب کا وجود انسانوں میں خوف کا شعور پرورش کرتا ہے اور بیکاری یا فرصت واقعیت سے بعید خیالات کی تخلیق کرتی ہے، حالانکہ خیالات کو پاک

کرنے کی ضرورت ہوتی ہے، اس شعور سے لاشعور پیدا ہوتا ہے، یہ نہایت اہم ہے کہ ان عناصر کا سائنسی تجزیہ کیا جائے، تاکہ انسان میں مذہبی شعور کی موجوں کا کامیابی سے مقابلہ کیا جا سکے۔"

انسان کی طبیعت میں بنیادی مذہبی جذبات کے بارے میں ایک اور ماہر نفسیات مستشرق فوبچیل کہتے ہیں:

"مذہبی اعتقادات کو ایک ضروری حاجت بنانے میں مذہبی احساسات کا کردار نہایت اہم ہوتا ہے۔"

لینن گراڈ کے ماہر نفسیات باؤڈیچین کا قول ہے کہ:

"مذہب پرستی کا مظہر انتہائی جذباتیت اور ذہنی فساد کے نتیجہ میں صادر ہوتا ہے۔"

کیف کے مستشرق بی۔ اے۔ لوبوچیک کا خیال ہے:

"مذہبی ذہنیت کا انسان دنیا کو دو حصوں میں تقسیم کر دیتا ہے، ایک تو عالم طبیعی، دوسرا عالم مافوق الطبیعی، ایسے انسان کی مدد یوں کی جا سکتی ہے کہ اس کے طبیعیاتی تصورات کو تقویت دی جائے اور خیالات کی اصلاح کی جائے۔"

لینن گراڈ کے ایک اور مستشرق ڈی ڈی ابتگمان کہتے ہیں:

"بنیادی طور پر ایک غیر مذہبی شخص ماحول کے اثرات سے مذہبی ہو سکتا ہے۔"

آر۔ بوگین کا اعتقاد ہے کہ

"مذہبی احساسات گرچہ شاذ ہیں، لیکن اصل بنیاد یہی ہیں اور انہی پر مذہبی تصورات کی بنیادیں استوار ہیں جو محض وہم اور فریب ہیں، چونکہ دینی احساسات کا مقابلہ احساسات ہی سے کیا جا سکتا ہے اس لیے یہ ممکن ہے کہ اس مذہبی شعور کی جگہ دوسرے احساسات کو ترغیب و ترہیب کے ذریعہ بدل دیا جائے۔"

مسلمانوں کے بارہ میں مستشرق جاکونسکی کے مبلغ علم کا اندازہ اس قول سے ہو سکتا ہے:

"اس دنیا میں لوگ ہمیشہ خدا کے وجود کے معتقد رہے، گو اس اعتقاد میں مذہبی روایات اور خرافات کا اثر کارفرما رہا، مسلمان بھی انہی لکیروں پر چل رہے ہیں جن کو قرآن نے ابھارا ہے، ان روایات میں سے یہ بھی ہے کہ وہ مہینہ بھر جسے وہ رمضان کہتے ہیں کھانے پینے سے باز رہتے ہیں۔"

مشہور مستشرق کلیمو فیتش جن کا ذکر اوپر بھی آ چکا ہے کہتے ہیں:

"کسی بھی مذہب پرست قوم کی ترقی اس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک وہ اپنے مذہبی عقائد کو بالکلیہ نہ ختم کر دے اور انسانیت کو گمراہ کرنے والے اپنے بوسیدہ افکار کو یکسر ترک نہ کر دے، مذہب کا خاتمہ ترقی کا تقاضا ہے اور اس کے لیے پیکار واجب ہے۔"

جمال الدین افغانی کی 'پان اسلامزم' تحریک کے بارہ میں کلیمو فیتش کا خیال ہے کہ:

"انیسویں صدی کے دوسرے نصف میں پان اسلامزم تحریک کی فکر مشرق میں ظاہر ہوئی، یہ تحریک رجعت پسندانہ سیاسی تحریک تھی۔"

اسلام کے بارے میں ان کا کہنا ہے کہ:

"اسلام کی اپنی خاص تاریخ ہے، اس کے عقائد، روایات اور خاص رسم و رواج ہیں، اسلام کو سمجھنے کے لیے سب سے پہلے یہ ضروری ہے کہ ان تاریخی حالات کا مطالعہ کیا جائے جن میں اسلام کی نشو و نما ہوئی۔

عرب سے باہر اسلام کے پھیلنے کی وجہ مسلمانوں کے فوجی حملے اور ان کی فتوحات ہیں، ایشیا و افریقہ کے تہذیب یافتہ ممالک کے باشندوں کو غلام بنا لیا جانا بھی اسلام کے پھیلنے کی ایک وجہ ہے، عربی فوجوں کے لشکر جب شہروں اور بستیوں پر قبضہ کرتے تو بربادی و پامالی کی جانب جلدی کرتے، لوٹ کھسوٹ، مقبوضہ علاقوں کے باشندوں کو غلام بنا لینا اور ان باشندوں کی اکثریت کو برباد کر دینا ان کا شیوہ تھا، مسلمانوں کا خلیفہ جو ایک بڑی حکومت کا صدر ہوتا تھا

اس کی ذات میں دینی، فوجی اور شہری اقتدار اعلیٰ بیک وقت جمع ہو جاتا۔

اسلام کے کاہنوں (علماء) کا فرض سب سے پہلے یہ ہوتا کہ وہ لوگوں کو خلیفہ کی اطاعت پر آمادہ کریں اور اس طرح وہ کھلے مالی استحصال کے لیے وجہ جواز قائم کرتے، جو اس دور میں عام تھا۔

چونکہ خلافت کے عہد میں اسلام، حکومت کا سرکاری مذہب ہوتا تھا، اس لیے حالات خود بخود ان کاہنوں (علماء) کو ممتاز مقام دینے میں معاون ہوتے"۔

کلیمو فیتش نے اپنی کتاب "اسلام، ماضی اور مستقبل" کو جس کے اقتباسات اوپر پیش کیے گئے، اس مشہور فقرہ پر ختم کیا ہے، یہ جملہ کتاب "مارکس و اینجلز" سے نقل کیا گیا ہے:

"مذہب ایک وہمی سعادت ہے اور حقیقی سعادت کے حصول کے لیے اس کا خاتمہ بہت ضروری ہے، مارکس کا قول ہے کہ مذہب ایک تاریخی مظہر ہے جس کی جڑیں طبقاتی معاشرہ میں پیوست ہیں اور پنپتی ہیں"۔

اس جائزہ کے بعد اس حقیقت میں کوئی شبہہ باقی نہیں رہتا کہ روسی استشراق اپنے حقیقی رجحانات و مقاصد میں اسلام کے خلاف علانیہ اور پیہم برسرپیکار ہے۔

مقالات سلیمان جلد دوم

از مولانا سید سلیمان ندوی رح

اس میں حدیث و سنت پر نہایت معرکۃ الآرا مضامین ہیں، ان میں حدیث و رجال حدیث کے بارہ میں مستشرقین کے اغلاط و مسامحات کی نشاندہی کی گئی ہے اور ان کی پیدا کردہ غلط فہمیوں کا ازالہ کیا گیا ہے۔ قیمت سترہ روپے۔ "منیجر"

امام ابوحفص ابن شاہین بغدادیؒ

از مولانا قاضی اطہر مبارک پوری، اڈیٹر البلاغ، بمبئی،

چوتھی صدی کے ائمہ حدیث و تفسیر میں حافظ ابوحفص ابن شاہین بغدادی متوفی ۳۸۵ھ رحمۃ اللہ علیہ صاحب تصانیف کثیرہ و عجیبہ محدث ہیں، اس مقالہ میں ان کے حالات اور ان کی تصانیف خصوصاً ایک اہم اور نادر کتاب تاریخ اسماء الثقات کا تذکرہ و تعارف مقصود ہے۔

اس سلسلہ میں ماخذ کے طور پر حسب ذیل کتابیں میرے پیش نظر ہیں۔ (۱) تاریخ بغداد، خطیب بغدادیؒ، (۲) تذکرۃ الحفاظ ذہبیؒ، (۳) العبر فی خبر من غبر ذہبیؒ، (۴) لسان المیزان ابن حجرؒ، (۵) المنتظم، ابن جوزیؒ، (۶) مرآۃ الجنان یافعیؒ، (۷) شذرات الذہب ابن عمادؒ، (۸) طبقات المفسرین داؤدی مصریؒ، (۹) الرسالۃ المستطرفہ کتانیؒ، ان کتابوں کے علاوہ النجوم الزاہرہ ابن تغری بردیؒ، اور غایۃ النہایہ فی طبقات القراء ابن الجزریؒ میں امام ابن شاہین کے حالات ہیں، مگر افسوس کہ فی الحال یہ کتابیں سامنے نہیں ہیں، مدت ہوئی غایۃ النہایہ کو استفادہ کیا تھا۔

خطیب بغدادی صرف ایک واسطے سے ابن شاہین کے شاگرد ہیں اس لئے تاریخ بغداد میں ان کے حالات نسبۃً تفصیل سے ہیں بعد کے تذکرہ نگاروں نے اس پر بہت کم اضافہ کیا ہے، اور تقریباً سب کا ماخذ تاریخ بغداد ہے۔

ہمارے علم میں اردو زبان میں سب سے پہلے مولانا عبدالرحمن محدث مبارک پوریؒ نے

کتاب الجنائز کے مقدمہ میں حافظ ابن شاہین کا مستقل تذکرہ کرکے ان کی کتاب الجنائز کی نشاندہی کی ہے، یہ تذکرہ گو مختصر ہے مگر طبقات المفسرین اور الرسالۃ المستطرفہ کے تذکرہ کی طرح اختصار کے باوجود اہمیت رکھتا ہے، یہ اتفاق علم وتحقیق کے لئے "حسن اتفاق" ہے کہ ان کا تذکرہ ایک مبارکپوری نے مختصر طور پر اور دوسرے مبارک پوری نے مفصل طور پر لکھا۔

نام ونسب ووطن اور ولادت،

خطیب نے اپنے استاد ابوالفتح عبدالکریم بن محمد محاملی کا یہ بیان نقل کیا ہے کہ ہم سے ہمارے استاد ابن شاہین نے بیان کیا ہے کہ میرا نام ابوحفص عمر بن احمد بن عثمان بن احمد بن ایوب بن ازداذ بن سراج بن عبدالرحمٰن ہے۔ میں نے اپنا نسب نامہ اسی طرح اپنے والد کی کتابوں میں پایا ہے، ہماری اصل علاقہ خراسان کے شہر مَرو روذ سے ہے، میرے نانا کا نام احمد بن علی بن یوسف ابن شاہین شیبانی ہے، میں نے اپنی تاریخ ولادت اپنے والد کی ایک کتاب کی پشت پر یوں دیکھی ہے: "میرا لڑکا عمر صفر ۲۹۷ھ میں پیدا ہوا"۔[۱]

بعد کے عام تذکرہ نگاروں نے حافظ ابن شاہین کی تاریخ ولادت صفر ۲۹۷ھ ہی لکھی ہے مگر شمس الدین محمد بن علی داؤدی مصری متوفی ۹۴۵ھ کی کتاب طبقات المفسرین میں ۲۷۷ھ لکھی ہے، ولد سنۃ سبع وسبعین ومائتین۔[۲] غالباً نسخ یا طبع کی غلطی سے اس میں تسعین (نوے ۹۰) کے بجائے سبعین (ستر ۷۰) ہوگیا ہے، اور مولانا عبدالرحمٰن محدث مبارکپوری صاحب تحفۃ الاحوذی نے کتاب الجنائز کے مقدمہ میں ان کا سن ولادت ۳۰۰ھ لکھا ہے۔[۳] جو درحقیقت ابن شاہین کی کتابت حدیث کی ابتداء کا سن ہے، جیسا کہ خود ان کا بیان آگے آئے گا، لسان المیزان میں سلسلۂ نسب میں اوپر کا نام ازداذ کے بجائے یزداد ہے،[۴] یزداد نام کے دو محدث کا تذکرہ تاریخ بغداد میں ہے، ایک یزداد بن موسیٰ بن جمیل بن سیّال، اور دوسرے یزداد بن عبدالرحمٰن بن محمد بن

ص ۲۸۳

۱ تاریخ بغداد ۱۱ ص ۲۶۵ ۲ طبقات المفسرین ج ۲ ص ۲ ۳ کتاب الجنائز ص ۴ ۴ لسان المیزان ج ۶

یزداد مروزی، نیز یمن میں یزداد نام کے ایک آدمی تھے، جن کے بیٹے عیسیٰ بن یزداد ہیں، عیسیٰ کی صحابیت میں اختلاف ہے،[۱]

ہمارے خیال میں ازداذ، یزداد ایک ہی نام کے دو تلفظ ہیں، اور یہ عجمی نام ہے، طبقۂ محدثین میں ابوحفص ابن شاہین یا صرف ابن شاہین کی کنیت سے مشہور ہیں، بعض دوسرے محدثین اور اہل علم بھی اس نام کے ہیں مگر ان کو یہ شہرت حاصل نہیں ہے، ابن شاہین کی کنیت ان کے نانا کے پردادا کے نام پر ہے، ان کا بیان ہے۔

وجدي لأمي اسمه احمد بن محمد بن يوسف ابن شاهين الشيباني	میرے نانا احمد بن محمد بن یوسف بن شاہین شیبانی ہیں،

سلسلۂ پدری سے معلوم ہوتا ہے کہ ابن شاہین کا نسلی تعلق عجم سے ہے البتہ سلسلۂ مادری کے اعتبار سے وہ عرب کے مشہور قبیلہ بنو شیبان سے تعلق رکھتے ہیں، مگر یہ معلوم نہیں ہوتا کہ یہ تعلق نسبی ہے، یا ولاء اور اسلام کا تعلق ہے۔

ابن شاہین کی ولادت بغداد میں ہوئی، ان کا مکان مشرقی جانب ایک میدان کے کنارے ہیزم فروشوں کے عقب میں واقع تھا، ان کا خاندان خراسان کے شہر مرو روذ سے تعلق رکھتا تھا، یہ معلوم نہ ہوسکا کہ کس زمانہ میں وہاں سے بغداد آیا، ابن شاہین کا بیان ہے۔

واصلنا من مرو الروذ من كورة خراسان	ہمارا خاندان علاقہ خراسان کے شہر مرو روذ کا ہے۔

خراسان میں مرو الروذ اور مرو الشاہجان دو بڑے شہر تھے، ان کے درمیان پانچ دن کی

۱ الاستیعاب ج ۲ ص ۶۳،

مسافت تھی، مرو سفید پتھر کو کہتے ہیں جس سے آگ پیدا ہوتی ہے یعنی چقماق اور رود ندی یا دریا کو کہتے ہیں، شہر مرو رود ایک بہت بڑے دریا کے کنارے پر آباد تھا، اور مرو شاہجان سے چھوٹا تھا، اس شہر سے بہت سے اہل علم و فضل پیدا ہوئے ہیں، جو مرو روذی اور مروذی کی نسبت سے مشہور ہیں، اس کے مقابلہ میں مرو شاہجان کی طرف نسبت مروزی ہے۔[۱]

ابن شاہین کا گھرانا پہلے سے علم و فضل اور مال و دولت میں شہرت رکھتا تھا، ان کے والد ابو الطیب احمد بن عثمان بغداد کے مشہور محدث اور عالم اور پیشہ کے اعتبار سے بزاز یعنی تاجر تھے، انھوں نے فضل بن موسی ہاشمی، محمد بن احمد بن جنید دقاق، عبید اللہ بن روح مدائنی، اور اس طبقہ کے دیگر مشہور ثقہ محدثین سے روایت کی تھی، اور ان سے ان کے صاحبزادے ابو حفص ابن شاہین، کے علاوہ ابو الحسین بن سمعون اور عبد اللہ بن محمد بن قیس بزاز وغیرہ نے روایت کی تھی، بقول خطیب ثقہ محدث تھے، ابن شاہین کا بیان ہے کہ میرے والد رجب ۳۲۷ھ میں فوت ہوئے، اور بغداد کے محلہ باب التین میں دفن کئے گئے،[۲] اس وقت ابن شاہین تیس سال کے طالب علم تھے۔

تحصیل و تکمیل امام ابن شاہین نے ایسے ماحول اور مقام میں آنکھ کھولی جس میں دین اور دنیا دونوں کے حسنات و برکات موجود تھے، بغداد دین و دنیا کا مجمع البحرین تھا۔ اس کا ہر گھر دار العلم اور ہر مکان دار الامارۃ تھا، خود ابن شاہین کے والد ثقہ محدث اور کامیاب تاجر تھے، انھوں نے اپنے بچے کی تعلیم و تربیت پر پوری توجہ دی، جس کے نتیجہ میں گیارہ سال کی عمر میں مکتب سے نکل کر محدثین کے حلقۂ درس میں بیٹھنے کے قابل ہو گئے، خود ان کا بیان ہے۔

واول ماکتبت الحدیث بیدی فی سنة

سب سے پہلے بحالت عقل و شعور میں نے ۳۰۸ھ میں اپنے ہاتھ سے

ثمان وثلث مائة وکان لی احدی عشرة سنة وکذا کتب ثلاثة من شیوخنا فی هذا السن فتبرکت بهم،

حدیث سنکر لکھی، اس وقت میری عمر گیارہ سال کی تھی، اور اسی طرح اسی عمر میں میرے تین اساتذہ نے بھی حدیث کی کتابت شروع کی تھی اور اس حسن اتفاق سے میں نے خیر و برکت پائی۔

ایک روایت میں ابن شاہین کا بیان یوں ہے۔

واول سماعی فی سنة ثمان وثلث مائة فتفاءلت فی ذلك بشیوخی النبلاء و رجوت ان اکون مثلهم،[۱]

سب سے پہلے میرا حدیث کا سماع ۳۰۸ھ میں ہوا اس بارے میں میں نے اپنے جلیل القدر شیوخ سے نیک فال لی، اور امید کی کہ میں بھی ان کے مانند ہو جاؤں گا،

ان کے یہ تینوں شیوخ امام ابو القاسم عبد اللہ بن محمد بن عبد العزیز بغوی، امام ابو محمد یحیٰ بن محمد بن صاعد، اور امام ابو بکر عبد اللہ بن سلیمان بن اشعث سجستانی ہیں، جو گیارہ سال کی عمر میں حدیث کے حلقۂ درس میں شریک ہوئے، اور آفتاب و ماہتاب بنکر نکلے،

ابن شاہین کی ذہانت و محنت اور ذوق و شوق کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ وہ گیارہ سال کی عمر میں اس دور کی مکتبی تعلیم سے فارغ ہو گئے، اور ان میں اتنی سمجھ بوجھ پیدا ہو گئی تھی جو صغر سنی میں حدیث کی کتابت و سماعت کے لیے معتبر ہے، انھوں نے اپنے بیان میں خاص طور سے اپنی عقل و ذہانت کا ذکر اسی لئے کیا ہے، کم سنی میں سماع و کتابت حدیث کے صحیح و معتبر ہونے میں محدثین کے مختلف آراء و اقوال ہیں، اہل کوفہ کے نزدیک بیس سال کی عمر میں

ہونی چاہئے جب کہ اہل شام تیس سال کہتے ہیں، اس کے برخلاف اہل بصرہ صرف دس سال کے قائل ہیں، نیز کسی نے پندرہ سال اور کسی نے تیرہ سال کہا ہے، مگر جمہور محدثین کے نزدیک عقل و شعور کی حالت میں قبل بلوغ بھی سماع و کتابت صحیح ہے۔ خطیب نے کفایہ میں لکھا ہے۔

قال جمهور العلماء يصح السماع	جمہور محدثین کا قول ہے کہ جس کی عمر
لمن سنه دون ذلك وهذا	اس سے کم ہو اس کا سماع بھی صحیح ہے
هو عندنا الصواب،[1]	اور ہمارے نزدیک یہی قول درست ہے،

ابن شاہین کے اس بیان سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ بچپن ہی سے ان میں عزم و حوصلہ، قوت اقدام اور علمی میدان میں اپنے اساتذہ کی طرح بلند مرتبہ ہونے کا احساس بدرجۂ اتم موجود تھا، اور اس کے لئے وہ زمانۂ طالب علمی سے کوشاں رہے، چنانچہ ان کے بلند پایہ تین اساتذہ میں سے ایک ابوالقاسم بغوی سے حسب روایت ازہری اس قدر زیادہ احادیث کا سماع کیا کہ ان کے پاس بغوی کی مسموعات و مرویات کے سات سو یا آٹھ سو اجزاء تھے،[2]

امام ابوبکر عبداللہ سجستانی امام ابوداؤد سجستانی کے صاحبزادے اور ابن شاہین کے شیوخ میں سے ہیں، ان کے حلقۂ درس کی کیفیت ابن شاہین نے یوں بیان کی ہے کہ ابن ابی داؤد آنکھوں سے معذور ہونے کے بعد ہم لوگوں کو اپنے حافظہ سے حدیث کا املاء کراتے تھے، وہ منبر پر بیٹھتے تھے، اور ان کے بعد والی سیڑھی پر ان کے صاحبزادے ابومعمر بیٹھتے تھے اور ان کے ہاتھ میں کتاب ہوتی تھی وہ اپنے والد سے کہتے تھے کہ فلاں حدیث، اس پر ابن ابی داؤد پوری حدیث زبانی پڑھتے تھے اور پوری مجلس سنکر لکھ لیتی تھی، (العبر ج ۲ ص ۱۲۴)

محراب و منبر پر درس حدیث کی یہ کیفیت ابن شاہین نے لذت لیکر سنائی، اسی طرح انھوں نے

---

[1] الکفایہ فی علم الروایہ ص ۵۴ [2] تاریخ بغداد ج ۱۱ ص ۲۶۸،

استاذ ادب اعلم الشعراء و اشعر العلماء ابن درید ازدی کے حلقۂ درس کی حالت یوں بیان کی ہے کہ جب ہم طلبہ ابن درید کے یہاں حاضر ہوتے تو یہ دیکھکر شرم و حیاء سے سر جھکا لیتے کہ نوّے سال سے زائد عمر ہو جانے کے بعد بھی ان کے یہاں خالص شراب اور آلات سرود و نغمہ پڑے ہوئے ہیں۔ (المنتظم ج ۶ ص ۲۶۲)

اس وقت بغداد کے گلی کوچے قال اللہ وقال الرسول کی صدا سے گونج رہے تھے، ہر مکان دارالحدیث اور ہر محلہ دارالعلم تھا، جوامع و مساجد اور ائمۂ حدیث کی مجالس اور حلقے طالبان علم و فضل سے معمور تھے، ابن شاہین نے اپنے گھر کے شیوخ و اساتذہ سے نہایت حوصلہ مندی سے اکتساب علم کیا، اس کے بعد اس دور کے رواج و مزاج کے مطابق دینی و علمی سفر پر کمر ہمت باندھی،

رحلت و سفر تیسری اور چوتھی صدی میں پورا عالم اسلام گویا دارالعلوم تھا، عالمی شاہراہوں پر طلبہ حدیث کے قافلے رواں دواں تھے، جن کے گھسے ہوئے جوتے، پھٹے ہوئے کپڑے گرد و غبار میں اٹے ہوئے چہرے، ہوا سے بکھرے بال، بھوک پیاس کے مارے ہوئے جسم تحصیل علم میں وارفتگی و دیوانگی کی خبر دے رہے تھے، قرب و جوار کے علمی مراکز ہی ان کا منتہائے سفر نہیں تھے، بلکہ چین سے لیکر اندلس تک کی مسافت ان کے زیر قدم تھی، محدثین کے اسی مقدس کاروان علم میں ابن شاہین بھی شامل تھے، انھوں نے بغداد سے نکل کر بصرہ، دمشق، شام، مصر اور فارس کا سفر کیا، ذہبی نے العبر میں اور ابن عماد نے شذرات الذہب میں لکھا ہے،

ورحل الى الشام والبصرة	ابن شاہین نے شام، بصرہ اور فارس
وفارس[1]	کا سفر کیا۔

نیز ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں ان کے سفر دمشق کے بارے میں لکھا ہے،

---

[1] العبر ج ۲ ص ۲۶، شذرات الذہب ج ۳ ص ۱۱۷،

وله رحلة الى دمشق لقى فيها ابا اسحاق بن ابى ثابت وطبقته[1]

ابن شاہین کا سفر دمشق کی طرف ہوا ہی، جس میں انھوں نے ابو اسحاق بن ابو ثابت اور انکے معاصرین سے ملکر استفادہ کیا،

اور داؤدی نے طبقات المفسرین میں تصریح کی ہے۔

وسمع القرأت عن ...... واحمد بن مسعود الزهري بمصر،[2]

انھوں نے تجوید و قراءت کی روایت ...... اور احمد بن مسعود زہری سے مصر میں کی۔

اس دور میں طلب علم میں روئے زمین کی خاک چھاننا اور اس کی وسعتوں کو قدموں سے ناپنا محدثین کا محبوب ترین مشغلہ تھا، اس راہ میں مقامات و منازل کا شمار کم ہمتی تھا، ابن شاہین کے تعلیمی رحلات و اسفار کے یہ چند بلاد و امصار منتہائے سفر نہیں ہیں، بلکہ انھوں نے ۳۰۸ھ سے ۳۳۲ھ تک تقریباً پچیس سالہ تعلیمی دور میں بہت سے ملکوں اور شہروں کا سفر کرکے وہاں کے شیوخ و اساتذہ سے کسب فیض کیا ہوگا، اس کا اندازہ ان کے ان اساتذہ کی فہرست سے ہوگا جن کا وطنی تعلق مختلف شہروں اور ملکوں سے ہے،

شیوخ و اساتذہ امام ابن شاہین کے شیوخ و اساتذہ میں بہت بڑی تعداد ائمہ حدیث و فقہ کی ہے، ان کے علاوہ مفسرین، قرآء و مجودین، عباد و زہاد، واعظین و مذکرین، علمائے لغت و ادب اور دیگر علوم و فنون کے مشاہیر شامل ہیں، انکے سوانح نگاروں نے ان میں سے چند کے نام درج کئے ہیں، ذیل میں کچھ حضرات کے نام لکھے جاتے ہیں:

(۱) شعیب بن محمد، ابو الحسن ذرع متوفی شوال ۳۰۸ھ (۲) عباس بن احمد بن محمد، قاضی ابو خبیب برتی متوفی شوال ۳۰۸ھ (یہ دونوں حضرات ابن شاہین کے بالکل ابتدائی شیوخ حدیث ہیں، ۳۰۸ھ میں ابن شاہین نے گیارہ برس کی عمر میں پہلے پہل حدیث کی کتابت و سماعت کی تھی

---

[1] تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۱۸۳، [2] طبقات المفسرین ج ۲ ص ۲۔

اور اسی سال ان حضرات کا وصال ہوا) (۳) عمر بن عبد اللہ بن عمر بن عثمان، ابو القاسم المعروف بابن ابی حسان زیادی متوفی ۳۱۲ھ۔ (۴) احمد بن محمد بن سلیمان بن حارث بن عبد الرحمٰن، ابو بکر ازدی واسطی المعروف بالباغندی متوفی ۳۱۲ھ (۵) حسن بن محمد بن عبد اللہ بن شعبہ، ابو علی انصاری، متوفی ذی قعدہ ۳۱۳ھ۔ (۶) محمد بن احمد بن ہشام، ابو نصر طالقانی متوفی ۳۱۳ھ ان کا نام احمد بن ہشام بھی بتایا گیا ہے، (۷) اسحاق بن ابراہیم بن خلیل، ابو یعقوب الجلاب، متوفی رجب ۳۱۴ھ (۸) عباس بن یوسف، ابو الفضل شکلی زاہد، متوفی شعبان ۳۱۴ھ۔ (۹) محمد بن جعفر بن بحر بن ابراہیم، ابو الحسین بزاز، المعروف بابن الخوارزمی متوفی ۳۱۴ھ۔ (۱۰) ایوب بن یوسف بن ایوب بن سلیمان، ابو القاسم بزار مقری متوفی ۳۱۵ھ۔ (۱۱) حسن بن محمد بن حسن بن صالح، ابو الحسین اسدی، متوفی ۳۱۵ھ۔ (۱۲) سلیمان بن داؤد بن کثیر بن وخدان، ابو محمد طوسی بغدادی، متوفی ۳۱۵ھ۔ (۱۳) زبیر بن محمد بن احمد بن سعید، ابو عبد اللہ متوفی ۳۱۶ھ۔ (۱۴) عبد اللہ بن سلیمان بن اشعث ابو بکر بن ابی داؤد سجستانی متوفی ۳۱۶ھ (۱۵) عبد اللہ بن محمد بن عبد العزیز بن مرزبان، ابو القاسم ابن بنت احمد بن منیع بغوی بغدادی متوفی ۳۱۷ھ۔ (۱۶) عبد الملک بن احمد بن نصر بن سعد، ابو الحسین خیاط، متوفی ۳۱۷ھ (۱۷) عبد الواحد بن محمد بن مہتدی باللہ، ابو احمد ہاشمی، راہب بنی ہاشم، متوفی ذی الحجہ ۳۱۷ھ (۱۸) یحیٰ بن محمد بن صاعد، ابو محمد مولی ابو جعفر منصور، متوفی ۳۱۸ھ۔ (۱۹) جعفر بن محمد بن مغلس، ابو القاسم متوفی ۳۱۹ھ۔ (۲۰) حسین بن حسین بن عبد الرحمٰن، ابو عبد اللہ انطاکی، المعروف بابن الصابونی متوفی ۳۱۹ھ۔ (۲۱) محمد بن ابراہیم بن محمد بن ابی الجیم، ابو کثیر شیبانی بصری متوفی ۳۱۹ھ۔ (۲۲) عباس بن بشر بن عیسیٰ بن اشعث، ابو الفضل المعروف بالرخجی بغدادی متوفی ۳۲۰ھ۔ (۲۳) سعید بن محمد بن احمد بن سعید ابو عثمان بیع، برادر

حافظ زبیر بن محمد، متوفی جمادی الآخرہ سنہ ۳۲۱ھ۔ (۲۴) محمد بن حسن بن دُرید، ابوبکر ازدی، علم الشعراء
واشعر العلماء والمعروف بابن دُرید متوفی سنہ ۳۲۱ھ۔ (۲۵) محمد بن احمد بن محمد بن عبداللہ بن ابی الثلج،
ابوبکر الکاتب متوفی سنہ ۳۲۲ھ۔ (۲۶) عبیداللہ بن عبدالرحمٰن بن محمد بن عیسیٰ، ابومحمد سکری متوفی
سنہ ۳۲۳ھ۔ (۲۷) عبدالحمید بن سلیمان، ابوعبدالرحمٰن وراق واسطی بغدادی متوفی سنہ ۳۲۳ھ
(۲۸) رضوان بن احمد بن احمد بن اسحاق بن عطیہ، ابوالحسن تمیمی (رضوان جالینوس) متوفی سنہ ۳۲۴ھ
(۲۹) عبدالرحمٰن بن سعید بن ہارون، ابوصالح اصبہانی بغدادی متوفی سنہ ۳۲۵ھ (۳۰) ابراہیم
بن عبدالصمد بن موسیٰ، ابواسحاق ہاشمی متوفی سنہ ۳۲۵ھ۔ (۳۱) موسیٰ بن عبیداللہ بن یحییٰ بن
خاقان ابومزاحم، وزیر خلیفہ متوکل، متوفی سنہ ۳۲۵ھ۔ (۳۲) محمد بن جعفر بن محمد بن حسن بن مستفاض ابوالحسن بن
ابی بکر فریابی متوفی سنہ ۳۲۷ھ۔ (۳۳) حسن بن احمد بن یزید قاضی قم زاہد المعروف بالاصطخری،
متوفی سنہ ۳۲۸ھ۔ (۳۴) حسن بن سعید بن حسن بن یوسف، ابوالقاسم وراق، ابن الہرشی
مروزی متوفی سنہ ۳۲۸ھ۔ (۳۵) حسین بن محمد بن سعید، ابوعبداللہ بزاز، ابن المطبقی متوفی سنہ ۳۲۹ھ
(۳۶) حاجب بن بلال بن حسن ابواحمد بخاری متوفی رجب سنہ ۳۲۸ھ۔ (۳۷) حمزہ بن حسین بن عمر بن
ابوعیسیٰ سمسار متوفی سنہ ۳۲۸ھ۔ (۳۸) عبداللہ بن سلیمان بن عیسیٰ بن ہیثم وراق، ابومحمد فامی
متوفی شوال سنہ ۳۲۸ھ۔ (۳۹) یوسف بن یعقوب بن اسحاق بن بہلول، ابوبکر الازرق تنوخی
الکاتب متوفی ذی الحجہ سنہ ۳۲۹ھ۔ (۴۰) عبدالغافر بن سلامہ بن احمد بن عبدا بن سلامہ
حضرمی حمصی متوفی سنہ ۳۳۰ھ۔ (۴۱) حبشون بن موسیٰ بن ایوب، ابونصر خلال متوفی شعبان
سنہ ۳۳۱ھ۔ (۴۲) احمد بن محمد بن سعید بن عبدالرحمٰن بن ابوالعباس کوفی، ابن عقدہ متوفی
ذیقعدہ سنہ ۳۳۲ھ۔ (۴۳) عبداللہ بن احمد بن اسحاق، ابومحمد جوہری مصری متوفی ربیع الاول سنہ ۳۳۲ھ
(۴۴) حمزہ بن قاسم بن عبدالعزیز، ابوعمر ہاشمی متوفی شعبان سنہ ۳۳۵ھ۔ (۴۵) محمد بن جعفر بن احمد

ابوبکر صیرفی مطیری متوفی صفر سنہ ۳۳۵ھ۔ (۴۶) عبدالرحمٰن بن محمد بن عبیداللہ بن سعد، ابومحمد
زہری متوفی ربیع الآخر سنہ ۳۳۵ھ۔ (۴۷) ابراہیم بن محمد بن احمد بن ابی ثابت، ابواسحاق عطار
متوفی سنہ ۳۳۸ھ۔ (۴۸) محمد بن عبداللہ بن دینار، ابوعبداللہ معدل زاہد حنفی نیشاپوری متوفی
سنہ ۳۳۸ھ۔ (۴۹) محمد بن احمد بن عمرو بن عبدالخالق بن خلاد، ابوالعباس عتکی بزاز متوفی شعبان
سنہ ۳۳۹ھ۔ (۵۰) عبیداللہ بن حسین بن دلال بن دلہم، ابوالحسن حنفی کرخی (کرخ جدان) متوفی
سنہ ۳۴۰ھ۔ (۵۱) عثمان بن احمد بن عبداللہ بن یزید، ابوعمرو دقاق، ابن السماک متوفی سنہ ۳۴۴ھ
(۵۲) یحییٰ بن محمد بن یحییٰ، ابوالقاسم قصباتی متوفی صفر سنہ ۳۴۴ھ۔ (۵۳) عبداللہ بن جعفر بن
درستویہ بن مرزبان، ابومحمد فارسی نحوی، متوفی صفر سنہ ۳۴۷ھ۔ (۵۴) جعفر بن محمد بن نصیر بن
قاسم، ابومحمد خواص خلدی، متوفی رمضان سنہ ۳۴۸ھ۔ (۵۵) اسمٰعیل بن علی بن اسمٰعیل،
ابومحمد خطبی متوفی سنہ ۳۵۰ھ۔ (۵۶) محمد بن حسن بن محمد، ابوبکر مقری نقاش موصلی متوفی سنہ ۳۵۱ھ
(۵۷) محمد بن عبداللہ بن ابراہیم ابوبکر شافعی بغدادی متوفی سنہ ۳۵۵ھ۔ (۵۸) محمد بن عمر بن
مسلم ابوبکر، ابن الجعابی، قاضی موصلی متوفی سنہ ۳۵۵ھ۔ (۵۹) حبیب بن حسن بن داؤد ابوالقاسم
قزاز متوفی سنہ ۳۵۹ھ۔ (۶۰) محمد بن ثابت بن احمد ابوبکر واسطی متوفی سنہ ۳۶۳ھ۔ (۶۱) احمد بن
جعفر بن حمدان، ابوبکر قطیعی متوفی سنہ ۳۶۸ھ (۶۲) محمد بن مظفر بن موسیٰ ابوالحسین بزاز، متوفی
سنہ ۳۷۹ھ۔ (۶۳) حسین بن احمد بن عبداللہ، ابوعبداللہ صیرفی سنہ ۳۸۰ھ۔ (۶۴) احمد بن
مسعود بن عمرو، ابوبکر زنبری متوفی سنہ ۳۸۳ھ۔ (۶۵) احمد بن موسیٰ بن عباس بن مجاہد
مقری، ابوبکر، شیخ القراء فی وقتہ متوفی سنہ ۳۲۴ھ۔ (۶۶) حسن بن حبیب بن عبدالملک،
ابوعلی حصائری دمشقی متوفی سنہ ۹ ھ۔ (۶۷) عبداللہ بن محمد بن زیاد، ابوبکر نیشاپوری
متوفی سنہ ۳۲۴ھ۔

ابن شاہین کے شیوخ واساتذہ کی یہ فہرست ان کے ہزاروں شیوخ کے مقابلہ میں بہت مختصر ہے، تحقیق وتلاش کے بعد اس میں بہت کچھ اضافہ ہوسکتا ہے[۱]۔

جامعیت امام ابن شاہین نے ۳۰۸ھ سے ۳۳۲ھ تک تقریباً پچیس سال بغداد، بصرہ، شام، دمشق، مصر اور فارس وغیرہ میں ہزاروں اساتذہ سے مروجہ دینی علوم حاصل کیے اور اپنے دور کے جامع الحیثیات محدثین میں شمار ہوئے، خاص طور سے محدث، مفسر، مقری، واعظ، ادیب، اور مصنف کی حیثیت سے اپنے اقران ومعاصرین میں ممتاز مقام کے مالک ہیں۔

حدیث وفقہ امام ابن شاہین سب سے پہلے حافظ الحدیث ہیں، تمام محدثین نے ان کی ثقاہت وامانت کا اعتراف کیا ہے۔ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں ان کو الحافظ، المفید، المکثر محدث العراق لکھا ہے[۲]، داؤدی نے طبقات المفسرین میں الامام، الحافظ، المفید، محدث العراق بتایا ہے[۳]، نیز ذہبی نے العبر میں اور ابن عماد نے شذرات الذہب میں الحافظ واحد اوعیۃ العلم کے الفاظ سے یاد کیا ہے[۴]، یافعی نے مرآۃ الجنان میں الحافظ اور شیخ کتانی نے الرسالۃ المستطرفہ میں الحافظ الکبیر کے لقب سے یاد کیا ہے[۵]، محمد بن ابو الغوارس نے کہا ہے۔

کان ابن شاہین ثقۃ ماموناً	ابن شاہین ثقہ ومامون محدث تھے،
قد جمع وصنف مالم یصنف	انھوں نے جس قدر جمع وتصنیف کا
احد	کام کیا ہے کسی نے نہیں کیا ہے۔

قاضی ابوبکر محمد بن عمرو داؤدی، ازہری، ابن ماکولا اور ابن شاہین کے معاصر وحریف

---

[۱] ان کے حالات کے لیے ملاحظہ ہو المنتظم، تاریخ بغداد، العبر، شذرات الذہب، طبقات الشافعیۃ الکبری اور طبقات ورجال کی دیگر کتب [۲] تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۱۸۳ [۳] طبقات المفسرین ج ۲ ص ۲، [۴] العبر ج ۳ ص ۹ و شذرات الذہب ج ۳ ص ۱۱۷ [۵] مرآۃ الجنان ج ۲ ص ۴۲۶ الرسالۃ المستطرفہ ص ۳۴۔

امام ابو الحسن دارقطنی نے ان کو ثقہ بتایا ہے[۱]۔ ازہری کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ میں نے ابومسعود دمشقی سے کہا کہ ابن شاہین ہم کو حدیث کا درس دیتے ہیں، تو ہمارے سامنے اصول یعنی اپنی مسموعات ومرویات کا اصل نسخہ نہیں رکھتے ہیں بلکہ فروع یعنی منقول نسخہ رکھتے ہیں اس پر ابومسعود دمشقی نے کہا۔

ان اخرج الیک ابن شاہین	اگر ابن شاہین تمہارے سامنے ٹھیکری
حدیثاً مکتوباً علی خزفۃ	پر لکھی ہوئی کوئی حدیث پیش کریں تو
فاکتبہ۔	تم اس کو بھی لکھ لو۔

یہ تاریخ بغداد کی روایت کے الفاظ ہیں، لسان المیزان میں یہ روایت یوں منقول ہے[۲]

ان اخرج الیک ابن شاہین	اگر ابن شاہین تمہارے سامنے کپڑے
خرقۃ علیہا حدیث مکتوب	کے ٹکڑے پر لکھی ہوئی کوئی حدیث لائیں
فاکتبہ[۳]	تو تم اس کو بھی لکھ لو۔

اللہ تعالیٰ نے طبقۂ محدثین کو قوت حفظ کے خاص انعام سے نوازا ہے، حافظہ اور یادداشت میں ابن شاہین بھی ممتاز تھے، ابن بقال کا بیان ہے کہ ابن شاہین نے بتایا کہ ایک مرتبہ میں سفر سے واپس آیا دیکھا کہ میری کتابیں ضائع ہوگئی ہیں، تو اپنی یادداشت سے ان کو جمع کیا جن کی تعداد بیس ہزار یا تیس ہزار تھی[۴]۔

ایک مرتبہ ابن شاہین کے ایک شاگرد ابو عمرو عثمان بن محمد بن احمد مخرمی قاری کوفی نے انکی سند سے ایک حدیث اس طرح بیان کی حدثنا عمر بن احمد النقاش یعنی ہم سے عمر بن احمد نقاش نے یہ حدیث بیان کی ہے، جب ابن شاہین کو معلوم ہوا کہ ان کی حدیث میں تدلیس فی الشیوخ

---

[۱] تاریخ بغداد ج ۱۱ ص ۲۶۷ [۲] تاریخ بغداد ج ۱۱ ص ۲۶۸، لسان المیزان ج ۴ ص ۲۸۴ [۳] ایضاً جلد ۴ ص ۲۸۴

کا ارتکاب ایک شاگرد نے کیا ہے، تو اس سے فرمایا کہ انا نقاش ؟ یعنی کیا میں نقاش ہوں،

اور اس وصف سے کیا میری شہرت ہے ؟ شاگرد نے جواب دیا۔

الست تنقش الكتاب بالخط ؟[1] — کیا آپ خط کے ذریعہ کتاب کو منقش نہیں کرتے ہیں ؟

ابن شاہین کے اس استفہام انکاری کی وجہ یہ ہے کہ تدلیس محدثین کے نزدیک سخت عیب ہے۔ اس کی ایک صورت یہ ہوتی ہے کہ راوی اپنے شیخ سے روایت کی ہوئی حدیث میں کسی مصلحت سے اس کے مشہور نام ولقب کے بجائے ایسی کنیت، یا نسبت یا صفت استعمال کرے جس سے وہ مشہور نہ ہو، یہاں یہی صورت تھی اور ابن شاہین کی مشہور کنیت کے بجائے نقاش کی صفت بیان کی گئی ہے جس کا مطلب اپنی طرف سے بیان کیا گیا۔

اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ابن شاہین احادیث کے بارے میں شدت احتیاط برتتے تھے، وجہ یہ ہے کہ ان کے ایک شیخ اور استاذ ابوبکر المقری النقاش (محمد بن حسن بن محمد بن زیاد موصلی متوفی ۳۵۱ھ) مشہور محدث اور قراءت کے امام ہونے کے ساتھ ہی نہایت عابد وزاہد بزرگ تھے، مگر منکر احادیث کی روایت کی وجہ سے متروک اور غیر ثقہ قرار پائے، وہ مشہور سندوں سے منکر احادیث بیان کرتے تھے، ذہبی نے لکھا ہے کہ ابوبکر نقاش اپنی جلالت شان اور علوئے مقام کے باوجود متروک وغیر ثقہ ہیں، اسی لئے ابن شاہین نے اپنے متعلق لفظ نقاش سے کر تدلیس کو دفع کیا۔

ابن شاہین اپنے حفظ وضبط واتقان پر اعتماد کی وجہ سے معارضہ ومقابلہ نہیں کرتے تھے یعنی اپنی مسموعات ومرویات کے اصل ذخیرے سے جو ابواب وتراجم اور کتابیں مرتب کرتے تھے ان فروع کو اصول سے ملا کر تصحیح نہیں کرتے تھے، حالانکہ اصل اور نقل میں معارضہ ومقابلہ کے

بغیر منقول کی صحت مشتبہ رہ جاتی ہے، اسی لئے محدثین اس کا بے حد اہتمام کرتے تھے، حضرت عروہ بن زبیرؓ اپنے صاحبزادے ہشام بن عروہؒ سے دریافت کرتے تھے کہ تم نے احادیث لکھ لیں ؟ اس کے بعد دریافت کرتے تھے کہ اصل سے نقل کو ملالیا ہے ؟ اور نفی پر فرماتے تھے کہ تب تم نے نہیں لکھا ہے[1] ابوابراہیم اسمٰعیل بن یحیٰ مزنیؒ کا قول ہے کہ اگر کسی کتاب کی تصحیح ستر بار مطالعہ ومعارضہ کر کے کی گئی ہو تب بھی اس میں کوئی نہ کوئی غلطی پائی جائے گی، امام احمد بن حنبلؒ کے صاحبزادے عبداللہ کہتے ہیں کہ میں نے والد کی ایک کتاب کا معارضہ ومقابلہ تیرہ بار کیا، اور چودہویں بار اس میں ایک غلطی نکل آئی تو والد نے کتاب ہاتھ سے رکھدی اور کہا کہ میں کتاب اللہ کے علاوہ کسی اور کتاب کو صحیح نہیں کہہ سکتا۔[2]

الغرض اصل اور نقل میں مقابلہ نہایت ضروری ہے، مگر ابن شاہین خود اعتمادی اور کثرت کار کی وجہ سے یہ کام نہیں کرتے تھے، اور ساتھ ہی برملا اس کا اعلان کیا کرتے تھے، تاکہ ان سے حدیث کا سماع کرنے والے واقف رہیں، اور کہیں کوئی بات نظر آئے تو اس کو عدم مقابلہ پر محمول کریں، محمد بن عمر داؤدی کا بیان ہے۔

سمعت ابن شاهين يقول انا اكتب ولا اعارض۔ — میں نے ابن شاہین کو کہتے ہوئے سنا ہے کہ میں لکھتا ہوں اور معارضہ ومقابلہ نہیں کرتا۔

اور برقانی کا بیان ہے۔

قال ابن شاهين جميع ما خرجته وصنفته من حديثي — ابن شاہین کا قول ہے کہ میں نے اپنی حدیث سے جو کچھ تخریج وتصنیف کیا ہے

لم یعارضہ بالاصول یعنی ثقۃ بنفسہ فیما ینقلہ قال البرقانی فلذلک لم استکثر منہ زھداً فیہ[1]

ان سب کو اصول سے نہیں ملایا ہے، یعنی اصل سے نقل کرنے میں اپنے اوپر اعتماد کی وجہ سے ایسا نہیں کیا ہے، راوی برقانی کہتے ہیں کہ اسی وجہ سے میں نے ابن شاہین سے زیادہ احادیث کی روایت نہیں کی۔

ابن شاہین اس بارے میں ان محدثین کا مسلک اختیار کئے ہوئے تھے جو معارضہ ومقابلہ کئے بغیر اس شرط پر فروع سے روایت کو جائز سمجھتے تھے کہ وہ اصول سے نقل کئے گئے ہوں اور اسی کے ساتھ یہ واضح اور بیان کر دیا جائے کہ ان کا معارضہ ومقابلہ نہیں ہوا ہے، فقیہ احمد بن محمد بن غالب نے ایک مرتبہ امام ابوبکر اسمٰعیلیؒ سے دریافت کیا کہ کیا کسی شخص کیلئے جائز ہے کہ ایسی کتاب سے روایت کرے جس کا اس نے اپنے شیخ کے اصل سے مقابلہ نہیں کیا ہے؟ تو امام ابوبکر اسمٰعیلی نے جواب دیا

نعم ولکن لابد ان یبین انہ لم یعارض لما عسی یقع من زلۃ او سقوط۔

ہاں یہ جائز ہے، مگر اس کے لئے ضروری ہے کہ ظاہر کر دے کہ اس نے مقابلہ نہیں کیا ہے کیونکہ ہوسکتا ہے کہ کہیں کوئی لغزش یا کمی ہوگئی ہو۔

اس کو نقل کر کے خطیب نے لکھا ہے۔

قلت، وھذا مذھب ابی بکر البرقانی، فانہ روی لنا احادیث

میں کہتا ہوں کہ امام ابوبکر برقانی کا یہی مسلک ہے، وہ ہم سے بہت سی

---

[1] تاریخ بغداد ج ۱۱ ص ۲۶۸۔

کثیرۃ، وقال فیھا انا فلان ولم یعارض بالاصل[1]

(الکفایہ ص ۲۳۹)

حدیثیں روایت کرتے کہتے تھے ان کو فلاں محدث نے ہم سے روایت کیا ہے اور اصل سے ملایا نہیں ہے۔

ابن شاہین ثقہ، ثبت، مامون اور قوی الحافظہ محدث تھے، اور تحدیث وروایت کے ساتھ اس قدر زیادہ کتابیں تصنیف کیں، کہ اقران ومعاصرین میں اس کی مثال مشکل ہے نیز وہ خود اعتمادی وخود شناسی کا مزاج رکھتے تھے، اس لئے انھوں نے اپنے شیوخ کی مسموعات ومرویات سے جو کچھ لکھا اس کا اصل سے مقابلہ ومعارضہ نہیں کیا، جس کا اعتراف واعلان کیا کرتے تھے، اس بنا پر محدثین نے ان پر اعتماد کیا، چنانچہ ان کے حلقۂ درس کے بعض طلبہ نے جب ابو مسعود دمشقی کے سامنے اس بارے میں اپنا خلجان پیش کیا اور کہا کہ ابن شاہین درسِ حدیث کے وقت اپنے اصل کے بجائے اس کے فرع کو ہمارے سامنے رکھتے ہیں، تو انھوں نے اطمینان دلایا اور کہا کہ اگر ابن شاہین کسی ٹھیکری یا پیوند پر لکھی ہوئی حدیث بیان کریں تو تم اس کا سماع کرو مگر اسکے باوجود معارضہ ومقابلہ نہ کرنا۔ اغلاط کو دعوت دیتا ہے، چنانچہ ابن شاہین پر لحان یعنی بہت زیادہ اعرابی کرنے کا الزام لگ گیا۔

(باقی)

تذکرۃ المحدثین (حصہ اول و دوم)

از ضیاء الدین اصلاحی

پہلی جلد میں دوسری صدی ہجری سے چوتھی صدی ہجری کے اوائل تک کے اہم محدثین کا تذکرہ ہے، اور دوسری میں چوتھی صدی سے آٹھویں صدی کے اوائل تک کے نامور اور صاحب تصانیف محدثین کے حالات وسوانح اور انکے خدمات حدیث کی تفصیل پیش کیگئی ہے۔

قیمت ۔ جلد اول ۱۷ روپیہ قیمت ۔ جلد ثانی ۱۹ روپیہ' منیجر

سرسید کے خطوط ——— ایک مطالعہ

از

جناب حامد مسعود صاحب، لکچرر شعبہ اردو، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

خطوط میں روابط کے صدرنگ دھاگے پلٹتے اور کھلتے ہیں۔ مکتوب نگار خط کے ذریعہ باتیں کرتا ہے تو اس میں وہ تمام احوال سمٹ آتے ہیں جو اس کی ذہنی کیفیت اور روزمرہ زندگی میں رونما ہونے والے حالات کی مخصوص جہت کی نشاندہی کرتے ہیں۔ غالب نے اپنے خطوط کو بزم آرا[ئی] کا نعم البدل قرار دیا جس کے نتیجے میں ان کے مشہور و معروف مکالماتی انداز نے نجی اور عصر[ی] روداد پیش کر کے شہرت دوام حاصل کی۔ غالب کے بعد سرسید ایک دوسری اہم شخصیت ہیں جن کے خطوط کا تفصیلی مطالعہ ہمیں نئے خالات اور واقعات سے روشناس کراتا ہے۔ اس میں مکتوب نگار کے ان افکار و خیالات کا بے محابا اظہار ہے جو انیسویں صدی کے بدلتے ہوئے ذہن کی ترجمانی کرتا ہے۔ ملک کے حالات کی تبدیلی کا اندازہ سرسید کی زندگی کے اس اہم فیصلہ سے لگایا جاسکتا ہے کہ انھوں نے اپنے عزیزوں کی مخالفت کے باوجود بائیس سال کی عمر میں انگریزوں کی ملازمت کو قلعہ معلی سے وابستگی پر ترجیح دی تھی۔ اس عمر میں حقائق کا صحیح تجزیہ کرنا سرسید کے کھلے ہوئے ذ[ہن] کا ثبوت ہے۔ وہ واضح طور پر سمجھتے تھے کہ مستقبل قریب میں حالات کا رخ کیا ہونے والا ہے۔ چنانچہ کچھ عرصہ بعد ۱۸۵۷ء کے تاریخی واقعہ نے ملک میں ایک نئے سیاسی نظام کو مستحکم کر دیا۔ اس پرآشوب [دور] میں سرسید نے فرض شناسی کا ثبوت دیتے ہوئے اس طبقہ کی وفاداری کو اپنا شعار بنایا جس کے

ملازم تھے۔ لیکن یہ انکی شخصیت کا صرف ایک پہلو تھا۔ ان دوسرے پہلوؤں کو اس کے بعد روشنی میں آنا تھا جو ملکی اور قومی اعتبار سے گراں قدر اہمیت کی حامل ہیں۔ غدر ۵۷ء کے فرو ہونے کے بعد قدرتی طور پر انگریز حاکموں نے مسلمانوں پر سرکشی کا الزام عاید کر کے ان کے وجود کو مشتبہ قرار دیا۔ دلی سیاسی طور پر تہ و بالا ہو چکی تھی جس کے نتیجہ میں اس کی شاندار تہذیبی قدریں اور شہرہ آفاق شخصیتیں بھی پامال ہو کر اپنا نام و نشان کھو رہی تھیں[1]۔ برگزیدہ ہستیوں کو جس طرح سرسری تحقیق کے بعد سرِ دار چڑھایا گیا۔ اور صاحبانِ جاہ و حشم جس طرح خاک میں ملائے گئے یہ تمام واقعات اس دور کی تاریخ میں ہمیشہ کے لئے اَن مٹ ہو گئے۔ ان حالات نے انگریزوں کی وفاداری کا دم بھرنے کے باوجود سرسید کے ذہن کو جس صورت حال سے دوچار کیا وہ ان کی شخصیت کے ایک دوسرے پہلو کو ہمارے سامنے لاتا ہے، آگے چل کر انھوں نے اپنے ایک لکچر میں[2] تباہی کے اس دور کا تذکرہ کیا ہے۔

"غدر میں جو حال انگریزوں اور ان کے بچوں اور عورتوں پر گذرا اور جو حال ہماری قوم کا ہوا اور نامی نامی خاندان برباد و تباہ ہوئے ان دونوں واقعات کا ذکر دل کو شق کرنے والا ہے۔ غدر کے بعد ...... مسٹر شیکسپیئر نے جن کی مصیبتوں میں ہم اور ہماری مصیبتوں میں وہ شریک تھے ...... جہاں آباد کا تعلقہ ...... جو ایک لاکھ سے زیادہ مالیت کا تھا مجھکو دینا چاہا تو میرے دل کو نہایت صدمہ پہونچا۔"

قوم کی بے عزتی کے غم نے سرسید کے بال سفید کر دیئے۔ مراد آباد میں رئیسوں کی بربادی نے جہاں انھیں متوحش کیا وہاں صبر و ضبط نے انھیں ایک نئی طاقت کا احساس بھی دلایا۔

"مگر اسوقت یہ خیال پیدا ہوا کہ نہایت نامردی اور بے مروتی کی بات ہے کہ اپنی قوم

---

[1] غالب کے خطوط میں غم و اندوہ کے یہ مرقعے جابجا ملتے ہیں۔ [2] یہ لکچر ۲۰ دسمبر ۱۸۸۹ء کو ایجوکیشنل کانفرنس کے جلسہ میں دیا گیا تھا۔ حیات جاوید۔ ص ۸۰

کو اس تباہی کی حالت میں چھوڑ کر میں خود کسی گوشہ عافیت میں جا بیٹھوں نہیں! اسکی مصیبت میں شریک رہنا چاہیے۔ اور جو مصیبت پڑے اس کے دور کرنے میں ہمت باندھنی قومی فرض ہے۔ میں نے ارادہ ہجرت موقوف اور قومی ہمدردی کو پسند کیا۔"

اس لحاظ سے غدر ۱۸۵۷ء مسلمان قوم کی تاریخ میں ایک اہم نقطہ ہے جو ایک طرف انکی بربادی کا مکمل اعلان ہے تو دوسری طرف اس تباہی کے خاکستر سے نئی زندگی کی امید بھی جنم لیتی ہے۔ سرسید کی قومی دردمندی کا منظم منصوبہ اس پس منظر میں ابھرتا ہے۔

دنیا کی تاریخ میں قوموں کی زندگی کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ بالعموم ہر زوال عروج کا پیش خیمہ رہا ہے۔ جس کی مثال یوروپ کا نشاۃ ثانیہ ہے۔ اس کا آغاز اٹلی میں ہوا لیکن رفتہ رفتہ اس سے تمام یورپ متاثر ہوا۔ اس سے فکر کو آزادی ملی۔ جس نے مذہبی اصلاح، تجدید علوم اور انسان دوستی کے تصورات کو فروغ دیا۔ انفرادیت نے اپنے اظہار کے لیے جو نئے راستے تلاش کیے ان میں عقلیت اور سائنس کے انکشافات انسانی ذہن کی حیرت انگیز جست ہیں۔ مغربی تجارتی کمپنیوں کے ذریعہ ہندوستان میں یہ اثرات نسبتہً مدھم انداز سے پہونچنے شروع ہوئے تھے جیسے جیسے انگریزوں کی سیاسی حکمت عملی نے یہاں اپنے اقتدار کا دائرہ وسیع کیا اسی لحاظ سے انکی ذہنی قدروں کا پرتو بھی منعکس ہوا۔ بنگال میں سب سے پہلے نشاۃ ثانیہ کے نقوش ملتے ہیں۔ راجہ رام موہن رائے مغربی نظریات سے متاثر ہو کر اپنے معاشرے کی اصلاح اور ترقی کے لیے سرگرم عمل ہوئے۔ کیشب چندر سین، رابندر ناتھ ٹیگور اور بنکم چندر چٹرجی نے قومی، مذہبی، سماجی اور ادبی بیداری کی مہم میں نمایاں کردار ادا کیا۔ انیسویں صدی کے عصری حالات سرسید کے ذہن پر اثر انداز ہوئے۔ انگریزی عملداری قائم ہو جانے کے بعد نئی صورت حال پیدا ہو گئی تھی۔ سرسید کو اپنی درماندہ قوم کے ذہن کو نئے حالات سے مطابقت پیدا کرانے کے لئے جو موثر طریقہ نظر آیا وہ یہ تھا کہ انگریزوں سے مفاہمت کی راہ

ہموار کی جائے، اور ان سے وہ چیزیں سیکھی جائیں جنھوں نے انھیں مشرق پر برتری عطا کی ہے۔ وہ ان ذہنی قدروں کا بچشم خود مشاہدہ کرنا چاہتے تھے جنھوں نے مغرب کو مغرب بنایا تھا۔ دراصل ان کو ایک دوسری تڑپ نے انھیں بیقرار کر رکھا تھا یعنی سر ولیم میور کی تصنیف لائف آف محمدؐ میں مذہب اسلام پر عاید کردہ حملوں کا دندان شکن جواب۔ اس کی مکمل تیاری کے لیے جن کتابوں کی ضرورت تھی وہ ہندوستان میں نہیں مل رہی تھیں، چنانچہ انگلستان پہونچکر ہی وہ مذہب اسلام کی صحیح تصویر پیش کر سکتے تھے۔ ان مختلف النوع مقاصد کی تکمیل کی پوری تفصیل ہمیں ان خطوط میں ملتی ہے جو انھوں نے لندن سے بھیجے تھے۔ قومی دردمندی اور مذہبی شغف [illegible] مضمونوں میں انھیں غور و فکر کی جن ریاضتوں سے گذرنا ہے اس جانکاہ عمل کی روداد اس لحاظ سے بھی لائق مطالعہ ہے کہ مکتوب نگار کی قومی اور مذہبی طرز فکر میں روایت سے انحراف کے اثرات پختہ تر نظر آتے ہیں۔

انگلستان پہونچکر سرسید راجہ جے کشن داس[2] کو ایک طویل خط تحریر کرتے ہیں جو دیار مغرب سے

۱؎ رخصت کی درخواست میں سرسید نے اپنے سفر انگلستان کی غرض و غایت میں اہل یورپ اور ہندوستان کے درمیان ربط و ضبط کو ترقی دینے کی کوشش قرار دی ہے۔ "پس اس مقصد کی تکمیل کے واسطے ہندوستانیوں کو میری رائے میں یوروپ کے سفر کی ترغیب دینی چاہیے۔ تاکہ وہ مغربی ملکوں کی شائستگی کے عجیب و غریب نتیجوں اور اس کی ترقی کو بچشم خود مشاہدہ کریں اور اس بات کا اندازہ کر سکیں کہ انگلستان کے لوگ کیسے دولت مند، طاقتور اور دانا ہیں۔ اور ان مفید اور عمدہ باتوں کو ہندوستان کی بھلائی کیلئے سیکھیں جو ان کے نتیجے ہیں کہ تجارت کے باب میں ہندوستان کے باشندے کیسے مستعد ہیں اور کارخانوں اور کاشتکاری اور شفاخانوں اور خیرات اور اس کے شہروں کی صفائی اور اسکی دولت اور علم سے روز بروز زیادہ کام لیا جاتا ہے۔ حیات جاوید۔ صفحہ ۱۳۱۔

۲؎ راجہ جے کشن داس علی گڈھ کے ڈپٹی کلکٹر۔ اگست ۱۸۶۷ء میں جب سرسید کا تبادلہ بنارس کا ہو گیا تو انھوں نے ان راجہ صاحب کو سائنٹیفک سوسائٹی کا سکریٹری بنایا تھا۔ راجہ جے کشن داس نے سوسائٹی کے کاموں میں بہت دلچسپی لی اور اخبار کی اشاعت میں تاخیر نہ ہونے دی۔

متعلق ان کے اولین تجربات اور تاثرات پر مبنی ہے۔ خط کے آغاز میں وہ اپنے سفرنامہ[۵۱] کی اگلی قسطیں نہ بھیجنے کی وجہ بیان کرتے ہیں کہ جب اہل وطن حقیقت کی تاب نہیں لا سکتے تو ان کی خوشنودی کی خاطر حقائق پر مصلحت کا پردہ ڈالنے کے لئے اپنی رائے محفوظ رکھنی مناسب ہے۔

"مجھ سے یہ تو ہو نہیں سکتا کہ جو کیفیت میرے دل پر گذرتی ہے۔ اور جو سچائی کہ میرے دل میں آتی ہے اس کو سوسائٹی کے ممبروں کے ڈر سے چھپاؤں اور جس گناہ کا الزام میں اپنے ہموطن ہندوستانیوں پر دیتا ہوں۔ خود بھی اس گناہ کا مرتکب ہوں اس لیے میں نے بہتر سمجھا کہ اس کا لکھنا موقوف ہی کر دیا جائے۔ اگر آپ میری آزادانہ رایوں اور باتوں کے چھپنے سے اپنی سوسائٹی کا کچھ نقصان نہیں سمجھتے۔ اور کچھ ممبروں کی بلکہ سوائے خدا کے اور کسی کی ناراضگی کا اندیشہ نہیں کرتے تو مجھ کو عام حالات کے بھیجتے رہنے اور یہاں کے عجائبات کے لکھنے اور نصیحت آمیز اور عبرت خیز باتوں کے بیان کرنے میں کوئی عذر نہیں ہے۔"[۵۲]

ان سطور سے اندازہ ہوتا ہے کہ مکتوب نگار سید احمد خاں کا الگ ہے، وہ مقاصد اس کے پیش نظر ہیں، جن کے تحت وہ انگلستان پہنچا ہے۔ وہ مغرب کی ان ذہنی قدروں کا بچشم خود مشاہدہ کرنا چاہتا تھا، جن سے اس کے ملک میں اہل بنگال نے سب سے پہلے فائدہ اٹھایا لیکن ہندو اور یا خصوصاً

---

[۵۱] بنارس سے لندن تک کے حالات سرسید نے تفصیل سے تحریر کئے، مگر جب اس کے کچھ حصے ہندوستان میں شائع ہوئے، تو مسلمانوں کی طرف سے اس پر اعتراضات کی بوچھار پڑنی شروع ہوئی، سرسید کو بھی لندن ہی میں مخالفت کا حال معلوم ہو گیا، اس لئے انھوں نے ناراض ہو کر سفرنامہ لکھنا موقوف کر دیا، حیات جاوید ص ۱۵۱

[۵۲] مکاتیب سرسید احمد خاں۔ مرتبہ (مشتاق حسین) ص ۱۵

مسلمان نئے حالات کی ضرورت سے بے نیاز اب تک تن بہ تقدیر ہی رہتے ہیں، اس لئے جب تک ان کے سامنے زندہ اور فاتح قوم کی ترقی کا راز پوری طرح نہ کھولا جائے، اور انھیں اپنی پسماندگی اور ذلت کے اسباب غیر جانبدارانہ انداز میں نہ بتائے جائیں، اس وقت تک اصلاح یا صحت کیونکر ممکن ہے، انگلستان کی سرزمین پر وہ جا بجا علوم و فنون کے خزانے بکھرے ہوئے دیکھتا، مغرب کی صنعت و حرفت اور سائنٹفک ایجادات جہاں اسے متحیر کرتی ہیں، وہاں اپنے ملک کی بے مائگی کے اسباب بھی روشن تر ہوتے ہیں، جب وہ یہاں کے معاشرے کے ادنیٰ سے لے کر امرائے طبقوں سے تعلق رکھنے والے افراد کی مخصوص تہذیب و شائستگی کے نمونوں کو دیکھتا ہے تو اپنوں کی کمزوریوں پر اس طرح حرف زن ہوتا ہے:۔

"ہم جو ہندوستان میں انگریزوں کو بد اخلاقی کا مجرم ٹھہرا کر (اگرچہ اب بھی ان کو اس الزام سے بری نہیں کرتا) یہ کہتے تھے کہ انگریز ہندوستانیوں کو بالکل جاہل سمجھتے ہیں، اور نہایت حقیر جانتے ہیں، یہ ہماری غلطی نہیں تھی، وہ ہم کو سمجھتے ہی نہیں تھے، بلکہ درحقیقت ہم ایسے ہیں، میں بلا مبالغہ نہایت سچے دل سے کہتا ہوں کہ تمام ہندوستانیوں کو، اعلیٰ سے لے کر ادنیٰ تک، امیر سے لے کر غریب تک، سوداگر سے لے کر اہل حرفہ تک، عالم فاضل سے لے کر جاہل تک انگریزوں کی تعلیم و تربیت اور شائستگی کے مقابلے میں درحقیقت ایسی ہی نسبت ہے، جیسے نہایت لائق اور خوبصورت آدمی کے سامنے نہایت میلے کچیلے اور وحشی جانور کو، پس تم کسی جانور کو قابل تعظیم یا لائق ادب سمجھتے ہو، کچھ اس کے ساتھ اخلاق یا بد اخلاقی کا خیال کرتے ہو، ہرگز نہیں کرتے پس ہمارا کچھ حق نہیں (اگرچہ وجہ ہے) کہ انگریز ہم ہندوستانیوں کو ہندوستان میں کیوں نہ وحشی جانور سمجھیں۔ (مکاتیب سرسید احمد خاں، مرتبہ مشتاق حسین ص ۱۵)

اپنے خط میں سرسید ایک کتاب کا تذکرہ کرتے ہیں، جو انڈیا آفس میں موجود ہے، اور انگریز افسران (جو سول سروس کا امتحان پاس کرنے کے بعد عنقریب ہندوستان جانے والے ہیں) ہندوستانی لوگوں اور ان کے رسم و رواج سے واقفیت حاصل کرنے کے لئے اس کا مطالعہ کرتے ہیں۔ لیکن یہ کتاب حیرت مند ہندوستانیوں کے لئے تازیانۂ عبرت ہے، مکتوب نگار اس ضمن میں ایک واقعہ پیش کرتا ہے، جو سید محمود کو پیش آیا،

"ایک دن میں اور حامد اور محمود انڈیا آفس میں گئے، محمود نے اس کتاب کو دیکھنا شروع کیا، اتنے میں ایک جوان انگریز شاید کوئی سول سروس پاس کئے ہوئے تھا، آن کھڑا ہوا، تھوڑی دیر بعد اس نے محمود سے پوچھا کہ تم بھی ہندوستانی ہو، محمود نے اسی وقت بلا خیال کہا (یس)، مگر یہ کہتے ہوئے اس کو ایسی شرمندگی ہوئی اور اس کا رنگ متغیر ہو گیا، اور اس نے کہا۔ I am
A foreign national and not an Indian
میں ہندوستان کی قوم کا آدمی نہیں ہوں، بلکہ پردیسی قوم کا ہندوستان میں آیا ہوں۔"[۵]

اس میں شک نہیں کہ، جیسے رسم و رواج قوم کی بیدار مغزی کی دلیل ہوتے ہیں، جن سے پورے معاشرے کے انداز فکر پر روشنی پڑتی ہے، اس وقت مکتوب نگار کے ذہن میں اپنے بنگالی اور پارسی بھائیوں کی تصویر ابھرتی ہے جنھوں نے ہوشمندی سے کام لے کر عصری حقائق کو سمجھنے کی کوشش کی، اور نئے حالات کے مطابق اپنے اندر تبدیلی پیدا کی، لیکن مسلمان ابھی تک پدرم سلطان بود کے مصداق ماضی کی داستان کو سینہ سے لگائے بیٹھے ہیں، اور حال کے تقاضوں سے

۵۔ مکاتیب سرسید احمد خاں مولفہ مشتاق حسین ص ۲۶،

لاتعلق نظر آتے ہیں،

"مگر ہمارے ہموطن ہندو اور کمبخت مسلمان بھائی اب تک کوئے جہالت میں پڑے ہوئے ہیں، .... اور شاید مسلمان تو تنے دنوں تک پڑے رہیں گے پھر وقت اور زمانہ اُن کی ترقی کا اور شائستگی کا باقی نہ رہے، کیونکہ اُن کو یعنی مسلمانوں کو جہل مرکب نے گھیرا ہے، اپنے باپ دادا کے قصے یاد کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ ہم سے بہتر کون ہے، اور حال میں جو باغ ان کے سامنے ہے، اور گل و پھول کھل رہے ہیں، اسی جہل مرکب نے اُن کی آنکھوں کو ان کے دیکھنے سے اندھا کر دیا ہے"[۶]

روحانیت کے بجائے حقیقت پسندی اور مشاہدہ نوازی کا احساس ہوتا ہے، راجہ جے کشن داس کو اپنی "پرائیویٹ لائف" کا جو حال سمجھتے ہیں، وہ کافی دلچسپ ہے، جس لاجنگ میں وہ فروکش ہیں وہاں انھیں، اپنے میزبان گھرانے کے طور طریقوں کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملتا ہے، حسن اتفاق سے یہاں ان کا سابقہ خواتین سے زیادہ پڑتا ہے، مسز لڈلم خاتون خانہ اور ان کی بہن مس السن وسٹ ہیں، ان کے علاوہ دو لڑکیاں این اسمتھ اور ڈلز میچ ماتھیوز ہیں، جو مہمانوں کی خدمت کی انجام دہی پر مامور ہیں، واحد مرد صاحب خانہ مسٹر لڈلم ہیں، جو علمی مشاغل میں ہمہ تن غرق رہتے ہیں، انھیں آفس جانے اور علمی جلسوں میں شرکت کرنے کے علاوہ کسی چیز سے سروکار نہیں ہے، مسز لڈلم نے انھیں گھریلو ذمہ داریوں سے آزاد کر رکھا ہے، مکتوب نگار خاتون خانہ کو "تہذیب اور اخلاق اور ادب اور انسانیت سب چیز کی مجسم قرار دیتے ہیں، جس نے اپنے وجود سے گھریلو زندگی کو حد درجہ منظم اور پرسکون بنا رکھا ہے" مس السن وسٹ کا ذوق کتب بینی مکتوب نگار کے لئے ایک حیرت ناک تجربہ ہے، ہماری کے

۶۔ مکاتیب سرسید احمد خاں، مرتبہ مشتاق حسین ص ۲۷،

عالم میں وہ مکتوب نگار سے کوئی کتاب پڑھنے کے لئے منگا بھیجتی ہے، مذہبی کتاب اردو وہ بھی ردو قدح اور جھگڑے والی کتاب) کو وہ نہایت شوق سے پڑھتی ہے، اور ملاقات ہونے پر وہ کتاب کے نفس مضمون سے متعلق ایسی مدلل گفتگو کرتی ہے، کہ مکتوب نگار بے اختیار ہو کر لکھتے ہیں

"کیا یہ تعجب خیز بات نہیں کہ ایک عورت حالت بیماری میں کتاب پڑھنے سے دل بہلاوے آپ نے ہندوستان میں کسی امیر کسی نواب کسی راجہ کسی مرد اشراف کو ایسی خصلت کا دیکھا ہو؟"[۱]

این اسمتھ اور الیزبیتھ ما تھیو زہکتے کو معمولی خادمائیں ہیں لیکن جس احساس ذمہ داری کے ساتھ وہ ہندوستانی مہمانوں کی دیکھ بھال کرتی ہیں، اسے دیکھ کر مکتوب نگار کا دل استعجاب اور حیرت کے ملے جلے جذبات سے مغلوب ہونے لگتا ہے، ان کی پابندی اوقات صفائی ستھرائی اور حسن انتظام قابل داد ہے، الیزبیتھ ماتھیوز اخبار بینی کی شوقین ہے قلیل آمدنی کے باوجود وہ ہاف پینی والا اخبار "اکو" خریدتی ہے اور فرصت میں اس کا مطالعہ کرتی ہے کبھی پنچ کا کوئی پرچہ لے کر اس میں عورتوں کی جو تصویریں میسز اور کسٹم پر ہوتی ہیں، انھیں دیکھتی اور ان کی کنایوں اور اشاروں کو سمجھ کر ان سے لطف اندوز ہوتی ہے مکتوب نگار الزبیتھ کے ان اوصاف سے متاثر ہو کر لکھتے ہیں

"آپ یقین جانئے کہ اگر یہ عورت جو نہایت غریب اور اصیل گری کی نوکری کی محتاج ہے، اور دن رات ہماری خدمت میں حاضر رہتی ہے، اگر ہندوستان میں جاوے اور اچھے سے اچھے امیر آدمی کی عورتوں سے ملے تو اُن کو محض جانور سمجھے، اور نہایت حقارت سے اُن سے نفرت کرے، (مکاتیب سرسید احمد خاں، مرتبہ مشتاق حسین، ص ۳۲،

لندن کے عوام میں مطالعہ کا ذوق اس قدر عام ہے کہ کیب مین اور کوچوان بھی اپنی گدی کے نیچے کوئی کتاب یا اخبار دبائے رکھتے ہیں جہاں سواری پہنچائی اور کیب (یا جو سواری ہو وہ) کھڑی کی، اور پڑھنا شروع کر دیا، تہذیب و شائستگی کے یہ نقوش اسے متاثر کرتے ہیں،

[۱] مکاتیب سرسید احمد خاں مرتبہ مشتاق حسین ص ۴۴

سرسید کے مشاہدات اور غور و فکر کا پورا عکس ہمیں ان خطوط میں نظر آتا ہے، جو انھوں نے لندن سے نواب محسن الملک کو بھیجے تھے، مخاطب سے مکتوب نگار کے قلبی لگاؤ کا اندازہ گرمجوشی میں ڈوبے ہوئے القاب و آداب سے لگایا جا سکتا ہے، وہ محسن الملک کو کبھی محبوب اور محب کہکر مخاطب کرتے ہیں، اور کہیں لحمک لحمی اور دمک دمی کے لقب سے سرفراز کرتے ہیں، محسن الملک سرسید سے بہت قریب اور معاملات سرزمین وطن میں اُن کے دست راست ہیں، پہلے خط میں ہم دیکھتے ہیں کہ مکتوب نگار مخاطب سے کیا توقعات رکھتے ہیں،

"مجھ کو علاوہ مفارقت احباب کے یہ رنج بڑا ہے کہ میرے پیچھے لوگ عقل کے دشمن سین ٹیفک سوسائٹی کو باقی نہیں رکھیں گے، پس میں چاہتا ہوں کہ آپ سوسائٹی کی طرف زیادہ متوجہ ہوں اور اس کو سنبھالنے اور ممبروں کو بڑھانے میں زیادہ کوشش فرماویں"[۱]

لندن میں مکتوب الیہ (محسن الملک) کا خط مکتوب نگار کے لئے باعث مسرت ہوتا ہے تو وہ (سرسید) اس کا اظہار والہانہ انداز میں کرتے ہیں، :-

"آپ کا عنایت نامہ مورخہ بلا تاریخ پایا، "اے وقت تو خوش کہ وقت ما خوش کردی" جس قدر دل کو مسرت آپ کے خط سے ہوئی ہے، بیان نہیں کر سکتا، اگر یوسف زلیخا کو یا لیلیٰ مجنوں کو ملتی، تو شاید اسی قدر خوشی ہوتی، جس محبت سے لکھا تھا، وہ اثر ان لفظوں میں موجود تھا، جس محبت سے آپ نے شعر لکھے تھے، ان کو پڑھ کر میں ایسا محو محبت ہوا، کہ گویا یہ سمجھنا دشوار تھا کہ وہ شعر میں نے آپ کے حق میں لکھے ہیں اور اس کیفیت سے وحدۃ الوجود کے مسئلے کا عقدہ حل ہوتا تھا،

[۱] خطوط سرسید مرتبہ سر راس مسعود ص ۴

میاں احمد و مہدی نہ ہیچ است حجاب — تو خود حجاب خودی احمد از میاں برخیز

اس میں مزاح کے طور پر محسن الملک کی شکستہ تحریر پر چوٹ کرتے ہیں :۔

"یہ بے تصنع آپ سے کہتا ہوں کہ آپ کی شکستہ رقمی نے اور بھی زیادہ لطف دیا، دو تین دفعہ پڑھنا پڑا، ایک دفعہ کے پڑھنے میں جو لفظ رہ گیا تھا، دوسری دفعہ میں نکلا، اور بہت زیادہ مزہ دیا، اسی وقت میرے دل میں مرزا مرحوم کا یہ شعر گذرا،[۵۱]

ز لکنت می تپد نبض رگِ لعل گہر بارش — شہید انتظارِ جلوہ خویش است گفتارش

مکتوب نگار کو محسن الملک کے اس ارادے کا پتہ چلتا ہے، کہ وہ لندن آنا چاہتے ہیں تو اس کا جواب ان کی محبت اور فرطِ اشتیاق کا آئینہ بن جاتا ہے، خلوص کا جذبہ والہانہ انداز میں ڈھلتا ہے، تو تحریر میں جاذبیت ابھرتی ہے، اس خط میں آغاز کا حُسن دیکھئے،

قبلہ گویم یا خدا یا کعبہ یا پیغمبرش — اصطلاح عشق بسیار است و من دیوانہ ام

قبلہ میرے، مخدوم میرے، محبوب میرے، محب میرے، (اب تو صاف لکھدوں جو ہو سو ہو:)

"سلامت! آپ کا عنایت نامہ پایا، اور عجیب کیفیت میں مبتلا کیا، کبھی اپنے آپ کو دیوانہ سمجھتا ہوں، کبھی تم کو دیوانہ جانتا ہوں، جو کچھ آپ نے لکھا ہے کبھی اس پر زور یقین لاتا ہوں، پھر شک میں پڑ جاتا ہوں، اگر آپ لندن میں آویں تو مجھ کو اور بالخصوص محمود کو جو خوشی ہو اس کا اندازہ غیر ممکن ہے"[۵۲]

ایسے صادق دوست سے دل کا حال کھل کھل کر بیان کرنا قدرتی بات ہے، چنانچہ لندن جو

۵۱ خطوط سرسید: مرتبہ سر راس مسعود ص ۱۲۔ ۵۲ ایضاً ص ۲۸۔

حکایت دراز تر گفتم" کے انداز میں سرسید محسن الملک کو اپنی انفرادی حکایت کا راز داں بتاتے ہیں :۔

سرسید انگلستان کی سرزمین پر بسنے والی قوم سے ترقی، بلند خیالی اور حریت فکر کے مفید سبق لینے کے خواہاں تھے لیکن یہاں ان کی حیثیت محض تماشائی کی نہیں تھی، مختلف النوع علمی، ملکی،[۵۳] اور قومی خدمات کی بنا پر خود ان کی شخصیت میں جو وزن اور وقار پیدا ہو چکا تھا اس کی شہرت اُن کی آمد سے قبل یہاں پہنچ چکی تھی، اور وہ انگلستان کے اہل علم ورا کے لئے اجنبی نہیں رہے تھے، چنانچہ یہاں، ان کا جس انداز سے خیر مقدم ہوا، وہ مکتوب نگار کی غیر معمولی شخصیت کا کھلا ہوا اعتراف ہے، تعریف و توصیف سے بے نیازی کے باوجود ان کے لئے یہ ایک خوشگوار تجربہ ہے، جسے وہ مکتوب الیہ کو بے اختیارانہ طور پر سناتے ہیں،

"لندن کے احباب و علماء و اشخاص نامی جس محبت و اخلاق و عنایت سے مجھ سے ملے اور صرف اپنے اخلاق سے مجھ غریب نالائق کی جس قدر خاطر کی، اس کا میں نے کبھی ذکر

۵۳ اسی وقت تک ان کی علمی دلچسپیوں کا دائرہ وسیع ہو چکا تھا، آثار قدیمہ، تاریخ سیاسیات، مذہبی موضوعات سے متعلق کتابیں شائع ہو چکی تھیں، ۱۸۴۷ء میں سرسید نے آثار الصنادید کے صفحات میں دلی کے آثار قدیمہ کو محفوظ کر دیا، .... تبیین الکلام میں انجیل اور قرآن کی اصولی وحدت ثابت کی، غدر ۱۸۵۷ء کے حالات پر اسباب بغاوت ہند لکھی، جس میں سیاسی مذہبی، معاشی، اور عسکری نقطۂ نظر سے واقعات پر روشنی ڈالی، بقول ہارون خاں شروانی "یہ رسالہ سیاسی طرز کا پہلا رسالہ ہی نہیں، بلکہ یہ پہلا سیاسی رسالہ ہے جو کسی ہندوستانی نے لکھا ہے" دی لائل محمڈنز آف انڈیا کے نام سے انھوں نے ایک رسالے کا اجراء کیا، جن میں، ان مسلمانوں کے حالات درج ہوئے تھے جنہوں نے ۱۸۵۷ء میں انگریزوں کی حمایت کی تھی،

نہیں لکھا، اگر وہ لکھا جاتا، تو مبالغہ پر محمول ہوتا۔"[1]

ملکہ معظمہ کی طرف سے ان کو سی ایس آئی کا خطاب اور اسٹار آف انڈیا کا تمغہ عطا ہوا، لارڈ لارنس، لارڈ اسٹینلے، ڈیوک آف ارگل، مارکوئیس آف لورن، اور ان کے علاوہ متعدد مشہور شخصیتوں سے ملاقاتیں رہیں، چارلس ڈکنس نے جب اپنی تصنیف کی آخری یا دلبند خوانی کی، تو حسن اتفاق سے مکتوب نگار اس جلسے میں موجود تھے، کارلائل سے اس کی تصنیف ہیرو اور ہیرو ورشپ کے بارے میں تبادلۂ خیال کیا، غرضیکہ انگلستان کے علمی، ادبی اور سیاسی حلقوں میں جہاں جہاں ان کا گزر ہوا، انھوں نے اپنے دقیع خیالات کا مفید اور خوشگوار اثر چھوڑا، مغربی ملکوں کی شائستگی اور ترقی کے مشاہدے کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے لیکن مکتوب نگار انگریزی حکومت کا وفادار ہونے کے باوجود آزادی رائے کے زبردست حامی ہیں چنانچہ اس کا اظہار وہ ان تمام موقعوں پر کرتے ہیں، جو وطن اور اہل وطن کے مسائل سے متعلق ہیں، ان کا رسالہ اسباب بغاوت ہند صاحبان ذی اقتدار کے مطالعہ سے گزر چکا ہے، جس میں ان حقائق کی نشاندہی کی تھی، جو اُن کی رائے میں غدر کے اصل اسباب تھے، اس کوشش کو کامیاب دیکھ کر ان کو خوشی ہوتی ہے، ایک ہندوستانی کی حیثیت سے وہ انڈیا کونسل کے ممبران سے اپنے ملک کے مسائل پر تبادلۂ خیال بھی کرتے ہیں، چنانچہ محسن الملک کو ان امور کے بارے میں اطلاع دی،

"میں انڈیا آفس میں صاحب سکریٹری وزیر ہند کے پاس گیا تھا، انھوں نے مجھے کونسل کے کاغذات میں میری کتاب "اسباب بغاوت" مع تمام و کمال انگریزی ترجمے کے دکھلائی، اسے دیکھ کر دل بہت خوش ہوا، جو کچھ رائیں اس کی بدولت قرار پائیں اس کا بیان بے فائدہ ہے، اہل ہند نا قدر داں

[1] خطوط سرسید ص ۱۲۔

دوست کش اور اپنے خیر خواہ کے دشمن ہیں، مگر میں خوش ہوں کہ میرے دوستوں کی بھلائی ہوئی ہے، اب ایک اور کتاب انتظام گورنمنٹ انڈیا پر لکھ رہا ہوں، انڈیا کونسل کے بعض ممبروں نے فرمایا کہ ہم ایک دن فرصت کا مقرر کرکے ہندوستان کے بارے میں گفتگو کریں گے، کچھ تھوڑی سی گفتگو نسبت انتظام پنجاب اور فائدہ میونسپل پر ہوئی اگر وہ کتاب چھپی اور مجھ اس کے چھاپنے اور انگریزی عبارت کی اصلاح میں جو خرچ ہوگا، اس کا مقدور ہوا تو آپ دیکھیں گے کہ میں کیا لکھ رہا ہوں، اور اس کتاب سے کس قدر فائدہ ہوگا اور کیسا صاف صاف لکھ رہا ہوں"[1] (باقی)

[1] خطوط سرسید ص ۲۹

اسلام اور مستشرقین

پر

دار المصنفین کا بین الاقوامی سیمنار

از

سید صباح الدین عبد الرحمن

(۵)

سیمنار کی تیسری نشست جناب سید حامد وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی صدارت میں شروع ہوئی اور اس کی کارروائی کو آگے بڑھانے کی ذمہ داری اس خاکسار نے لی، یہ نشست صرف پاکستان کے مقالہ نگاروں کے لیے مخصوص کر دی گئی تھی۔

خاکسار نے عرض کیا کہ یہ نشست صرف پاکستانی وفد کے مقالہ نگاروں کے لیے مخصوص کر دی گئی ہے ہم پاکستانی وفد کے اراکین کے شکر گذار ہیں کہ انھوں نے دور دراز سفر کی تکلیفیں برداشت کرکے اس سیمنار میں شرکت کی اور ہم کو اپنے لطف و کرم سے نوازا، پاکستان سے جو حضرات تشریف لائے ہیں ان میں سب سے زیادہ نمایاں شخصیت جناب حکیم محمد سعید دہلوی کی ہے جو کسی تعارف کے محتاج نہیں، ان کا نام اس وقت پوری دنیا میں پھیلا ہوا ہے، البتہ بعض حیثیتوں سے میں ان کا ذاتی طور پر بے حد ممنون ہوں کہ ان کے ایسے احسانات ہیں جو میرے دل کے اندر رہ کر میری قبر میں ساتھ ہی جائیں گے۔ ان کے ساتھ کراچی سے ڈاکٹر فرید الدین بقائی اور حکیم نعیم الدین زبیری صاحب

بھی آئے ہیں، مفتی سیاح الدین کاکاخیل رکن اسلامی نظریاتی کونسل بھی تشریف لائے ہیں، لیکن وفد کی صورت میں اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ اسلام آباد کے معززین آئے ہوئے ہیں، ان کے سربراہ ڈاکٹر عبد الواحد ہالی پوتا ہیں جو اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے بڑے محبوب ڈائرکٹر ہیں ان کے جلو میں جناب عبد القدوس ہاشمی ہیں جو اسی انسٹی ٹیوٹ میں پروفیسر ہیں، ڈاکٹر شرف الدین اصلاحی بھی ہیں جو اسی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے رسالہ فکر و نظر کے بڑے قابل ایڈیٹر ہیں اور جناب محمود احمد غازی ریڈر اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، ڈاکٹر محمد طفیل اور اسی انسٹیٹیوٹ کے لائبریرین ڈاکٹر احمد خان بھی ہیں، ان حضرات کی تشریف آوری سے مجھ کو ذاتی طور پر انتہائی خوشی ہے اور میں دار المصنفین کی طرف سے ان کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔

ایک بات عرض کرنا چاہتا ہوں کہ ہمارے استاذ مولانا سید سلیمان ندوی فرمایا کرتے تھے کہ جو دار المصنفین کا مہمان بن کر یہاں آتا ہے اس کو میں اخلاص کا پیکر سمجھتا ہوں، اس لیے کہ اس دور افتادہ مقام تک سفر کرنا آسان نہیں، ہوتا، دلی اور لکھنؤ پہونچنا تو آسان ہوتا ہے اور وہاں پہونچ کر کسی سے ملتے جانے میں یہ فائدہ ہوتا ہے کہ اپنا ذاتی کام بھی کر لیا جاتا ہے اور کسی سے مل کر یہ احسان جتا دینے میں آسانی ہوتی ہے کہ صرف ان سے ملنے کی خاطر یہ سفر کیا ہے، لیکن دار المصنفین میں وہی لوگ آتے ہیں جو صرف دار المصنفین دیکھنے کا شوق رکھتے ہیں، کیونکہ یہاں کسی اور تفریح کا سامان نہیں ہے، اس لیے پاکستان کے لوگوں نے سفر کی جو صعوبتیں برداشت کرکے یہاں آنے کی زحمت گوارا کی، ان کو دار المصنفین کے لوگ اخلاص کا پیکر سمجھ رہے ہیں، مجھ کو یہ بھی معلوم ہوا کہ جب میری طرف سے ڈاکٹر ہالی پوتا صاحب کو دعوت نامہ پہونچا تو اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کا پورا اسٹاف یہاں آنے کے لیے خواہشمند اور تیار ہوا، جب اس کی خبر انسٹی ٹیوٹ کے صدر ڈاکٹر نبی بخش بلوچ وائس چانسلر اسلامیہ یونیورسٹی اسلام آباد کو ہوئی تو انھوں نے کہلا بھیجا کہ

اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کو تو پھر بند کرنا پڑے گا، یہ کسی لحاظ سے مناسب نہیں، میرا دعوت نامہ ان کی خدمت میں بھی پہونچا تھا، لیکن انھوں نے ایک خط میں اپنی مشغولیتوں اور مجبوریوں کا ذکر کر کے لکھا ہے کہ ان کی زندگی کی بڑی آرزو یہ تھی کہ وہ دارالمصنفین کو دیکھیں، اس موقع پر حاضر ہوتا تو یہ آرزو پوری ہو جاتی، معلوم نہیں آیندہ زندگی میں یہ آرزو پوری ہو سکے بھی یا نہیں، سیمینار کے لیے اپنی نیک خواہشات کا اظہار صدق دل سے کیا ہے۔

اب میں سب سے پہلے جناب ڈاکٹر ہالی پوتا صاحب سے گذارش کروں گا کہ وہ یہاں تشریف لا کر اپنے تاثرات کا اظہار کریں، اس موقع کے لیے جو باتیں ان کے ذہن میں آئی ہوں ان سے ہم لوگوں کو محظوظ کر کے شکر گذار کریں، اس خاکسار کو دارالمصنفین کے کاموں کے سلسلہ میں اسلام آباد میں بہت دنوں تک قیام کرنا پڑا، مولانا کوثر نیازی وزیر امور مذہبی حکومت پاکستان کے ایماء پر اسلام آباد کلب میں جناب ہالی پوتا کی نگرانی میں اس خاکسار کی جو پذیرائی کی گئی اس کی یادوں کی شمع اب تک روشن ہے، اس کی ایک شاندار افطار پارٹی میں پاکستان ریڈیو والوں اور اخبار نویسوں نے دارالمصنفین سے جو دلچسپی ظاہر کی، اس کے لیے یہ خاکسار ان کا بہت ممنون ہوا، اسلام آباد میں میرا زیادہ تر وقت انسٹی ٹیوٹ ہی میں گذرا، جہاں پہونچ کر ایسا محسوس ہوتا تھا کہ دارالمصنفین میں ہی بیٹھا ہوں، ڈاکٹر ہالی پوتا صاحب نے ہر قسم کی مادی، علمی اور اجازت دیجیے تو یہ بھی کہوں کہ روحانی نوازشوں سے نوازا، ان کے متعلق بغیر کسی شک و شبہہ کے یہ کہہ سکتا ہوں کہ پاکستان کے اچھے لوگوں کی ایک فہرست تیار کی جائے تو اس میں ان کا نام نامی ضرور ہوگا، کیونکہ میرا ذاتی خیال ہے کہ ان کے دل کو چیر کر دیکھا جائے تو اس میں حسین اور خوشبودار گلاب کی پنکھڑیاں رکھی ہوئی نظر آئیں گی۔

جناب عبدالواحد ہالی پوتا | جناب صدر! میں جناب سید صباح الدین عبدالرحمن کا بہت شکر گذار ہوں

کہ انھوں نے میرے متعلق یہ سب کچھ کہا ہے، یہ خود ان کے ذاتی خلق کی دلیل ہے، وہ صرف اچھی چیزوں کے دیکھنے کے عادی ہو گئے ہیں، ہم لوگوں کو دارالمصنفین سے بہت ہی گہرا تعلق ہے، کیونکہ اس مرکز سے جو انوار ظاہر ہوئے ہیں ان کو کوئی کیونکر نظر انداز کر سکتا ہے، میں اپنی طالب علمی کے زمانہ سے دل میں یہ خواہش رکھتا تھا کہ اس مرکز کی زیارت کروں اور جب جناب سید صباح الدین کا خط آیا تو میرے لیے یہ دعوت نامہ نہ تھا گویا یہ حکم تھا، اس کی تعمیل میرے لیے ضروری ہو گئی، اسی تعمیل کی خاطر میں یہاں حاضر ہو گیا ہوں، آپ اگر اجازت دیں تو میں اپنے خیالات کا اظہار انگریزی زبان میں کروں۔

اس کے بعد وہ انگریزی میں بولے جس کا خلاصہ یہ ہے: میں کچھ بول کر آپ لوگوں کے معلومات میں اضافہ نہ کر سکوں گا، لیکن مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں کچھ بولوں، تو کچھ باتیں سماعت کرنے کی تکلیف گوارا کریں، اس سے مجھ کو یہ اعزاز بھی حاصل ہو جائے گا کہ اس عظیم اور مقدس تقریب میں میری شرکت بھی ہو گئی، میں زیادہ تر اپنے ذاتی تجربات کو بیان کرنا چاہتا ہوں جو مجھ کو مستشرقین کے سلسلہ میں حاصل ہوئے ہیں، میں یہ عرض کرنے کی اجازت چاہتا ہوں کہ میں ۱۹۳۶ء سے ان مستشرقین کا مطالعہ کر رہا ہوں، ان کی طرف میری توجہ ڈاکٹر داؤد پوتا نے دلائی، جو اسماعیل کالج جو گیشوری بمبئی میں تھے، میں نے اسلامی علوم مدرسہ کی تعلیم میں بھی حاصل کیے ہیں، میں جب ہائی اسکول میں تھا تو میرے ساتھ ہندو طلبہ بھی تھے اور ہندو اساتذہ بھی، جن سے اسلام کے متعلق باتیں ہوتی رہتی تھیں، لیکن جب مجھ کو مولانا عبید اللہ سندھی کی صحبت کا شرف حاصل ہوا تو انھوں نے مجھ کو شاہ ولی اللہ کا مطالعہ کرنے کی ترغیب دی اور پھر ان ہی کی خواہش کے مطابق حجۃ اللہ البالغہ پڑھنا شروع کیا، اور جب میں انگلستان گیا تو پروفیسر نکلسن اور پروفیسر میکڈانلڈ سے ملنے کی عزت حاصل ہوتی رہی، ان کی کتابیں اور تحریریں پڑھ کر ان سے بہت سے معلومات

ضرور حاصل کرتا، لیکن یہ بنیادی بات سمجھ کر ایسے لوگوں کی تحریریں پڑھنی چاہئیں کہ یہ لوگ مسلمانوں کو ان کے مذہب اور مذہبی عقائد کو سمجھانے کے لیے کتابیں نہیں لکھا کرتے بلکہ وہ اپنے عیسائی مبلغین کے لیے لکھا کرتے ہیں، وہ ہمارے مذہب، ہماری تاریخ کے کمزور پہلوؤں کو اس لیے پیش کرتے ہیں کہ عیسائی مبلغ ان ہی کو اچھال کر اسلام کے خلاف زہر چکانی کریں اور ان کو اپنے مذہب کی تبلیغ میں مدد حاصل ہو، وہ بعض ایسی باتیں بھی لکھ جاتے ہیں جن کا تعلق نہ ہمارے مذہب سے ہے، نہ ہمارے مذہبی عقائد سے، لیکن وہ اپنے عیسائی مبلغین کے لیے کچھ مواد فراہم کر دیتے ہیں، اور یہ مبلغین ان کو روشن ضمیر اور راسخ العقیدہ مسلمانوں کی تصنیفات بنا کر لوگوں کو گمراہ کرتے ہیں،

مجھ کو پروفیسر گب کی شاگردی کی بھی عزت حاصل ہوئی، وہ مجھ پر بے حد مہربان تھے اور مجھ کو زیادہ سے زیادہ وقت دیا کرتے، انھوں نے مجھ کو وہاں کا اہم وظیفہ دلایا تاکہ میں رہنے سہنے، پڑھنے لکھنے، حتی کہ اپنے مسودات ٹائپ کرانے میں زیادہ سے زیادہ سہولت حاصل کر سکوں، ان کو شاہ ولی اللہ سے بڑی دلچسپی پیدا ہوگئی اور ان کی نگرانی میں میں نے اپنے مقررہ وقت سے پہلے ہی مقالہ ختم کر لیا، جس کی تعریف پروفیسر گب نے کی، لیکن اس کو دو بڑے مستشرقین نے منظور کرنا پسند نہیں کیا، ان میں ایک مستشرق پاکستان بھی آئے اور ان کو یہاں اعزازی ڈگری دی گئی، وہ اپنے مذہبی تعصب کی بنا پر شاہ ولی اللہ کو پسند نہیں کرتے تھے۔ مجھ سے یہ بھی کہا گیا کہ یہ مقالہ اگر منظور بھی کیا گیا تو اس کو یورپ میں نہیں چھپنا چاہیے، اس سے ان مستشرقین کے مذہبی اور ذہنی تعصب کا بھی اظہار ہوتا ہے، پروفیسر گب نے محمڈن ازم پر کتاب لکھی اور جب میں نے ان سے اس کتاب پر گفتگو کی تو انھوں نے اس کا اعتراف کیا کہ محمڈن ازم کی اصطلاح صحیح نہیں ہے لیکن یہ کتاب مارگولیتھ کی محمڈن ازم کی جگہ پر لکھی گئی ہے، اس لیے اس کا نام بھی نہیں بدلا گیا، اس میں مارگولیتھ کی طرح چونکا دینے والی باتیں نہیں ہیں، اس کتاب کو پڑھ کر دل کو وہ صدمہ نہیں پہونچتا، جو

مارگولیتھ کی کتاب کے مطالعہ سے پہونچتا ہے، گو ان کی بعض باتوں سے اختلاف کیا جا سکتا ہے، لیکن یہ ملحوظ رکھنا چاہیے کہ انھوں نے اور پادری اسکالرس کی طرح یہ کتاب نہیں لکھی، لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی خیال رکھنا چاہیے کہ وہ مسلمان نہیں تھے، میں ایک مستشرق بینٹ سے بھی ملا، جن کو صوفی ازم سے بڑی دلچسپی تھی، اور صوفی ازم پر نصاب میں کچھ کتابیں بھی رکھوائیں، جن میں کشف المحجوب بھی تھی، میں نے ان سے کہا کہ وہ اپنے کو مسلمان تو نہیں کہتے، لیکن وہ مسلمانوں کی روایت کا احترام کرتے ہیں، یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ مستشرقین میں کچھ اسکالر ایسے ہوتے ہیں جو یا تو خود پادری ہوتے ہیں، یا خاندانی حیثیت سے پادری بنے رہتے ہیں، ہمارے مقالہ کو جس مستشرق نے پسند نہیں کیا وہ پادری ہی تھا، ان پادریوں سے ہم کو کسی قسم کی ہمدردی کی توقع کرنا صحیح نہیں، ہم کو خود اپنے لٹریچر پر بھروسہ رکھنا چاہیے اور ہم خود اپنے یہاں ایسے قابل قدر اور وزنی لٹریچر پیدا کر لیں کہ ہمارا اور ہمارے نوجوانوں کا ذہن ان مستشرقین کی کتابوں سے متاثر نہ ہو، لوگ مجھ سے پوچھتے ہیں کہ ماڈرن اسلام پر کوئی کتاب لکھی گئی، میں کہتا ہوں کہ یہ ماڈرن اسلام کیا ہے، اگر خرافات کا نام ماڈرن اسلام ہے تو پھر ایسی چیزوں پر کوئی کتاب لکھنے کی ضرورت نہیں، مسلمان جو کچھ آج کل کرتے ہیں یا کہتے ہیں، اس کو اسلام سمجھنا اسی طرح صحیح نہیں ہوگا جس طرح نازی ازم یا اسی طرح کے اور ازم کو کوئی کرسچینیٹی یا عیسائیت کہے۔

اس تقریر کے بعد خاکسار نے مولانا عبد القدوس ہاشمی کی خدمت میں عرض کیا وہ تشریف لائیں اور اپنے خیالات کا اظہار کریں، مولانا عبد القدوس صاحب کے بارے میں صرف اتنا کہنا ہے کہ اگر فقہی، مذہبی، تاریخی، سیاسی اور دنیا بھر کے معلومات کو نچوڑ کر ایک پیکر بنایا جائے تو وہ مولانا عبد القدوس ہاشمی کی ذات ہوگی، انھوں نے اسلام اور مستشرقین پر ایک کتاب لکھی ہے جس کے ترجمے مختلف زبانوں میں ہو چکے ہیں، وہ اب تشریف لا رہے ہیں۔

مولانا عبدالقدوس ہاشمی: اعوذ باللہ، بسم اللہ، الحمد للہ الذی لا الٰہ الا وحدہٗ، والصلوٰۃ والسلام علی النبی الذی لا نبی بعدہٗ۔ حقیقت واقعہ یہ ہے کہ ہم بوڑھے ہو چکے ہیں، اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ ایک لطیفہ سنا کر چلا جاؤں گا، میں مقالہ وقالہ لکھ کر نہیں لایا ہوں، مقالہ میرا کئی زبانوں میں شایع ہو چکا اور کئی رسالوں میں بھی اور بڑی گالیاں کھائی ہیں مغرب والوں کی، پروفیسر اسمتھ کا ذکر ہو رہا تھا، ...... میں نے ان کو بڑا قابل، بڑا معقول، اور بہت عمدہ آدمی پایا، میری ان سے بہت سی ملاقاتیں رہیں، وہ کہنے لگے کہ کیا اسلام ہمیشہ سے تھا؟ میں نے کہا بالکل، وہ تھا۔ کہنے لگے کہ اسلام کے لفظی معنی ہیں اطاعت کے لیے سر جھکا دینا۔ میں نے کہا بالکل ٹھیک معنی! کس کی اطاعت کے لیے؟ انھوں نے کہا: اللہ کی اطاعت کے لیے، میں نے کہا: اور یہ بتاؤ کہ ان کا علم کیسے ہوگا؟ ٹیلیفون پر تو اللہ میاں بولتے نہیں ہیں، ٹیلی گرام دو تو جواب نہیں دیں گے، خط لکھو تو جواب نہیں دیں گے تو یہ معلوم کیسے ہوگا کہ ان کی اطاعت کیسے ہو؟ میں نے کہا سنو! ایک لڑکا تھا، وہ کہتا تھا کہ یہ آدمی جو کھڑے ہیں میرا ماموں ہے، میں نے کہا کہ واقعی تم کو معلوم ہے کہ یہ تمھارا ماموں ہے؟ تم اپنی ماں کو سچی سمجھتے ہو کہ یہ اس کا بھائی ہے؟ کہنے لگے نہیں! ماں کی صداقت پر مجھے شبہہ ہے، میں نے کہا تو ماموں کیسے ہوئے؟ یہ بیان کر کے میں نے کہا بھائی! محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) قرآن مجید کو خدا کی کتاب کہتے ہیں۔ ..... میں نے کہا اچھا بھائی وہ جو خدا کی مرضی تھی، وہ مرضی معلوم کیسے کریں گے اور خدا کی اطاعت کیسے کریں گے، کوئی ذریعہ نہیں۔ اس لیے سیدھی بات کا اقرار کیجیے کہ اگر رسول اللہ کی صداقت کا یقین ہے تو سمجھ میں آئے گا کہ یہ کیا ہے، ورنہ اس کے علاوہ پیمائش ہوگی، سرے سے یہ عقل کی بات ہی نہیں کہ جب خدا کی مرضی ہی نہیں معلوم تو خدا کی رضا کی کوشش کیسے ہوگی۔ کہنے لگے کہ یہ تو سب کہتے ہیں، میں نے کہا: اچھا عیسیٰ مسیح کی زبان سے

نکلا ہوا کوئی ایک ٹکڑا اسناد و جس میں وہ خدا کی مرضی بیان کرتے ہوں وہ کہنے لگے کہ یہ تو نہیں ہے، میں نے کہا پھر کس افسانہ کی بات کرتے ہو، اس اسلام کی جو حضرت آدمؑ سے لے کر رسول اللہ صلعم تک تھا، اس کی تعبیر صرف ایک ہی کر سکتے ہیں کہ جو رسول اللہ صلعم نے کر کے بتلایا اور کہہ کے بتلایا، حضرت موسیٰؑ نے بھی یہ بتایا ہوگا، حضرت ابراہیمؑ نے بھی یہی بتایا ہوگا، حضرت نوحؑ نے بھی یہی بتایا ہوگا لیکن بابا ہیں کہاں ان کے الفاظ، تم کہتے ہو کہ ترجمے کے ترجمے کا ترجمہ، اور اس کے ترجمہ کرنے والے کا نام نہیں بتلاتے ہو، اس لیے یہ مہمل سی بات ہے، ایک لطیفہ تو یہ سنا دیا آپ کو کہ اماں کو تو سچا ہم کہیں گے لیکن ابا کو ابا کہیں گے، اچھا کیسے کہیں گے، ایسا اچھا ہوا و مارغ ہے، معمولی مسائل میں، اور معلوم ہوگا بات کہہ دی بڑی عالمانہ، حالانکہ انتہائی مہمل بات ہے، خبر کی کوئی قیمت نہیں ہوتی ہے جب تک مخبر کی صداقت پر ایمان نہ ہو، خبر ہمیشہ محل صدق و کذب ہے، جب تک کہ مخبر کو صادق نہ مان لیا جائے، دنیا کا سارا انٹرنیشنل لا ختم ہو جائے گا، دنیا کا نظام ختم ہو جائے گا اگر اس قسم کی کوئی ترتیب نہ ہو تو رسول اللہ صلعم مخبر ہیں اور ان کے علاوہ کسی اور مخبر کے الفاظ ہمارے پاس نہیں، پھر اس کے بعد اللہ کی اطاعت کے اور کون سے طریقے ہیں، اتنا غلط منطقی دعویٰ ہے یہ کہ اس کا جواب نہیں ہو سکتا، جب میں نے یہ سمجھایا تو خیر ادھر ادھر کی بات کرنے لگے، بس قضیہ ختم۔

ایسے ہی ایک اور لطیفہ سنایا اور اب تین منٹ میں دوسرا لطیفہ سنا دوں، جب میں جینن گیا تو وہاں ڈاکٹر آف پیچرل گگاند فس بتلایا کرتے تھے کہ مرنے کے بعد کچھ نہیں ہوگا، سب غلط ہے، یہ ہوتا ہے، اور وہ ہوتا ہے، انھوں نے مجھ سے وقت لیا کہ ملنے آ رہا ہوں، میں نے کہا ضرور آئیے، آئے انھوں نے ایک گھنٹہ تقریر کی اور کہنے لگے کہ [illegible]ت ہے پوچھنے کی؟ میں نے کہا پوچھنے کی کیا بات رہی، زندگی بھر پریشان رہے کہ اس کے بعد کیا ہوگا مسئلہ ہو گیا آج تم نے چھٹکارا دیا، اب جو جی چاہے سو کرو، شکریہ بھائی! اب کیا سوال کروں۔ انھوں نے کہا تمھیں نہیں کچھ سوال کرو!

میں نے کہا: اچھا بھائی تو صرف یہ بتلا دیجیے کہ مرنے کے بعد کچھ نہیں ہوتا ہے، اس کی خبر آپ کو کیسے ہو گئی؟ کہنے لگے کیا سوال ہوا؟ میں نے کہا سامنے ایک درخت ہے، اس کے پیچھے ایک مکان ہے، اس مکان میں کوئی عورت بیٹھی ہے کہ نہیں بیٹھی ہے، جواب دے سکتے ہو؟ اگر تم اس کا جواب ایجابی دیتے ہو کہ ہاں ہے تو تمھیں اس کا علم ہونا چاہیے، سلبی دیتے ہو تو اس کا علم ہونا چاہیے، اگر میں تم سے پوچھوں کہ تم نے اس کو وہاں جاکر دیکھا؟ اور جواب میں تم کہدو کہ کبھی نہیں دیکھا، اچھا اگر کسی دیکھنے والے نے تم کو جواب دیا تب تم کیا کہ سکوگے کوئی دیکھنے والا ہی نہیں، اچھا اب تمھارے جواب کی قیمت کتنی رہ گئی، حساب لگاکر بتاؤ، تو صفر، سرے سے بے معنی ہو کر رہ گئی، سارا جواب تمھارا صفر ہو کر رہ جاتا ہے، اس لیے کہ تمھارے پاس علم ہی نہیں، اس لیے کہ نہ تم نے خود دیکھا، نہ کسی دیکھنے والے کو دیکھا، تو میں کہتا ہوں کہ مرنے کے بعد کچھ نہیں، ہوتا سوال جواب اس کا تجربہ آپ کو کتنی بار ہوا، کتنی مرتبہ مر کر دیکھا؟ کہنے لگے کبھی نہیں، میں نے کہا کسی مرنے والے نے آکے جواب دیا؟ کہنے لگے وہ بھی نہیں، تو میں نے کہا اچھا مکمل جہالت پر یقین رکھتے ہو، کیا قیمت ہو گی، مکمل جہالت، بے معنی، سرے سے غیر منطقی بات، میں نے کہا تمھارے پاس کوئی ذریعہ نہیں، تو غصہ میں کہنے لگا تو تمھارے پاس کیا ذریعہ ہے؟ میرے پاس باون ۵۲ برس کا بوڑھا نہایت نیک آدمی چلا آتا ہے اور وہ کہتا ہے کہ میں نے معراج میں جاکر اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے، چشم دید شاہد ہوں، اب دو ہی صورتیں ہو سکتی ہیں، یا وہ جھوٹا ہے یا سچا ہے، میں نے تلاش کرنا شروع کیا تو وہ بیوی کو پکڑا، حلیمہ کو پکڑا جس نے پہلا قطرہ دودھ پلایا تھا اس بوڑھے آدمی کو، اس نے کہا کہ نہیں کبھی جھوٹ نہیں بولا، حلیمہ سے پوچھا کہ تیری گود میں تتلا کر بولنا سیکھا تھا، اس نے کہا کہ کبھی جھوٹ نہیں بولا۔

عقبہ بن ابی معیط پھر ابولہب سے پوچھا، ابوجہل سے پوچھا اور بی بی سودہ بنت ابی زمعہ سب نے کہا کہ نہیں صاحب یہ جھوٹ نہیں بولا، تو میں سر پکڑ کر بیٹھ جاتا ہوں کہ آخر یہ شخص اپنے فائدہ کیلیے

جھوٹ نہیں بولتا ہے، اپنی مخالفت کے لیے جھوٹ کاہے کو بولے گا، تب ہم نے اس کو سچ تسلیم کیا، اس کی بات مان لی، ہم بھلے آدمی ہیں اور تم بے وقوف ہو، میں نے کہا سیدھی سی بات ہے، میں ایک ڈاکٹر کے پاس پہونچا، اس نے میری نبض پکڑی اور کہا تم کو مرض پیچش ہے اور اس نے شیشی نکال کر دی، اس کے اوپر لکھا ہوا تھا 'پوائزن' اور اس شیشی سے نکال کر ایک ٹکیہ دی کہ اس کو کھا جاؤ، تب میں نے نہ ڈاکٹر کی رجسٹریشن دیکھی نہ سرٹیفکٹ دیکھا، بس دوا کھا گیا، انھوں نے کہا ہاں یہی ہوتا ہے، میں نے کہا میرے دوست! تم نے ڈاکٹر کا بورڈ دیکھ کر اپنی جان اس کے حوالہ کر دی تو تم بہت عقلمند ہو اور ہم نے باون ۵۲ برس ٹھونک بجاکر اس کو دیکھا اور اپنا ایمان اس کے حوالہ کر دیا تو ہم بے وقوف ہیں، دیکھیے اصل بات یہ ہے ان لوگوں کے سوچنے کا انداز علمی طور سے غلط ہے، ان کا انداز فکر ہی اتنا غلط ہے کہ وہ غلط نتائج تک پہونچتے ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ تم کو یہ نظر آتا ہے کہ دنیا میں جتنی تحریکیں پیدا ہوتی ہیں، وہ کسی ایک رخ کو متاثر کرتی ہیں، کوئی اقتصادی ہوتی ہے، کوئی سیاسی ہوتی ہے، مگر ایک تحریک ایسی پیدا ہوئی جس نے انسانی زندگی کے ہر رخ کو متاثر کیا، نکاح وطلاق کے قواعد بدل دیے، کھانے پینے کے اصول بدل دیے، سوچنے کے طرز بدل دیے، یہ بدل دیے، وہ بدل دیے، ایسی عظیم الشان تحریک جو انسانی زندگی کے ہر پہلو کو متاثر کرتی چلی گئی اور اس تحریک کو برپا کرنے والا وہ بے بس دبے کس انسان ہے جس کے پیچھے نہ کسی شہزادگی کی روایت ہے، نہ وہ کسی کالج کا سند یافتہ ہے، لیکن اس کے باوجود اس کی تحریک کامیاب ہوئی اور اتنی کامیاب ہوئی کہ اپنی زندگی ہی میں کمال تک پہونچتے دیکھا، نو لاکھ ستائیس ہزار چھ سو مربع میل پر اس کی حکومت قائم ہو گئی، دس برس کے اندر، جو دیکھتا ہے گھبرا جاتا ہے، ایسا بے کس آدمی کہ طائف کے بازار میں ڈھیلے پھینک رہے ہوں لوگ اور کوئی ایک گلاس پانی تک دینے والا نہیں، اور صرف دس ۱۰ برس کے عرصہ میں اتنے بڑے رقبہ پر اس کی حکومت قائم ہو جاتی ہے، ایسی کامیابی کس نے دیکھی،

جب کہ تاریخ انسانی کی سات ہزار معلوم تاریخ اس بات پر شاہد ہے کہ دنیا میں کسی تحریک چلانے والے
نے اپنی زندگی میں اس کو کامیاب ہوتے نہیں دیکھا، یاد رکھیے کہ انسانی زندگی اتنی چھوٹی ہے کہ کوئی
تحریک کبھی کامیاب نہیں ہوتی کسی انسان کی زندگی میں۔ ایک واقعہ ہے انسانی تاریخ میں، صرف
ایک واقعہ ہے کہ محمد رسول اللہ ﷺ نے تحریک چلائی اور اپنی زندگی میں کامیابی سے اس کو دیکھ لیا جب
ایسا واقعہ ان کی سمجھ میں نہیں آتا ہے انگریز بے چارے پڑھنے والے کہ تو پھر وہ طرح طرح کی باتیں
نکالتا ہے، یہ کچھ جہالت ہے، کچھ اپنے تعصب سے، اس کو اتنی موٹی بات سمجھ میں نہیں آتی کہ اس کی
وجہ یہ تھی کہ مسلمانوں کو جب ایمان ہونے کی بنا پر رسول اللہ پر ایمان کامل ہو گیا، یہ بات غیر مسلم کو سمجھ میں نہیں
آتی، ...... اصل سوال یہ ہے کہ کائنات میں کچھ مقدس صداقتیں ہیں، ان پر سب متفق ہیں
کہ انسان کو ایسا ہونا چاہیے، جھوٹ نہیں بولنا چاہیے، بددیانت نہیں ہونا چاہیے، وغیرہ۔
یہ عالمگیر صداقت ہے، اس میں کوئی اختلاف نہیں، اس میں کسی مذہب اور ملت کا بھی فرق نہیں ہے،
بس اک صداقت والا آدمی دنیا سے گم ہو گیا تھا، انسان کو نظر نہیں آرہا تھا، رسول اللہ ﷺ کی جب
بعثت ہوئی تو دنیا نے دیکھا کہ اچھا بھلا آدمی کسے کہتے ہیں، جب پہلی بار رسول اللہ ﷺ ایک بھلے
آدمی نظر آگئے تو بھلے آدمی کا جو پیمانہ انسانیت نے آدمؑ سے لے کر اب تک قائم کر رکھا تھا، اس پر
ایک آدمی صحیح اترا، اس کے بعد سب کے سب جھک گئے، یہی تو ایک آئیڈیل تھا جس کو دنیا
تلاش کر رہی تھی۔ تو مستشرقین کے مطالعہ کے لیے چاہیے کہ ہم ایک باقاعدہ لٹریچر پیش کریں۔
"دنیا کو سمجھائیں کہ تم ایمان سے نہیں سمجھتے تو اتنا تو سمجھتے ہو کہ وہ آئیڈیل انسان تھا، بھلا
آدمی جو تھا وہ دنیا میں سات ہزار برس سے نہیں مل رہا تھا، مختلف وقتوں میں پیغمبر کوشش
کرتے رہے، لیکن ایسا آئیڈیل نہیں مل رہا تھا اور جب رسول اللہ ﷺ کی ذات میں انسانیت نے
ایسا آئیڈیل دیکھا تو ...... یہ اتنی موٹی سی بات ہے جو تم کو سمجھ میں نہیں آرہی، تم دیکھو کہ

اس نو لاکھ مربع میل میں کتنا حصہ ملٹری آپریشن کے ذریعہ آیا، صرف چار ہزار مربع میل، تو مستشرقین
صاحبان میں غلطی کیا یہ ہے کہ یہ صحیح طرح سے منطقی طور پر سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے، اب رہی دشمنی تو مفتوح
قوم کو فاتح قوم سے ہمیشہ دشمنی رہی ہے، ہم کو چاہیے کہ ہم مربوط طریقہ سے صرف ان کی تردید میں نہیں،
بلکہ صحیح ترین نقشہ پیش کریں، بھلا دیکھیے اس میں کیا منطقی مغالطہ ہے، سیدھی بات ہے کہ رسول اللہ ﷺ
کی ذات میں ایک مکمل انسان نظر آ گیا، نہ سمجھ میں آنے والی کیا بات ہے، میں نے پروفیسر اسمتھ سے
کہا کہ بڑا غیر منطقی انداز ہے آپ لوگوں کا، منطقی انداز یہ ہے کہ معلومات جمع کر دو اس طرح کہ اصل حقیقت
خود سامنے آجائے۔

<u>مولانا علی میاں</u>: حضرات! قبل اس کے کہ دوسرے فاضل مقالہ نگار حضرات تشریف لائیں،
میں نے عابد رضا بیدار صاحب کے ایک سوال کے جواب میں جو کچھ کہا تھا اس سلسلہ میں کچھ وضاحت
کر دوں کہ اہل علم کا مجمع ہے اور طالب علم کو اپنی غلطی یا کمزوری کا سب سے پہلے اعتراف کرنا چاہیے
میں نے دو حدیثوں کا حوالہ دیا تھا جس میں پہلی حدیث جو تھی کہ ما شاء اللہ و شئت، اس پر
تو مجھے اعتماد ہے کہ اس کے الفاظ یہی ہیں، لیکن من یطع اللہ و رسولہ، اس کے الفاظ پر مجھے
اعتماد نہیں، شاید میرے حافظہ نے کوتاہی کی ہے، اس لیے ان الفاظ کی صحت کی میں ذمہ داری
نہیں لیتا، اور یہ بھی وضاحت کر دوں کہ ایسے مظاہر سے احتیاط جن سے شرک پیدا ہوتا ہو، اس کے
علاوہ باقی جو کچھ ہے اس کی حقیقت یہی ہے کہ بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر، اور سچی بات یہ ہے
کہ ہمیں اس وقت جو دولت اللہ نے نصیب فرمائی ہے اسلام اور ایمان کی شکل میں، بلکہ انسانیت
اور عقل سلیم کی شکل میں، وہ سب محمد رسول اللہ کا صدقہ ہے، میں ان الفاظ کا اظہار ضروری سمجھتا تھا
کہ کوئی اور غلط فہمی نہ ہو کہ ...... صرف شرک سے بچنے کی ضرورت ہے، ورنہ اس کے بعد تو واقعہ یہ ہے کہ
علمی، عملی، واقعاتی اور تاریخی طور سے دنیا میں جو صداقتیں موجود ہیں اور جن کا حصہ اللہ تعالیٰ نے

ہم کو عطا فرمایا وہ سب محمد رسول اللہؐ کی لائی ہوئی ہے، اور انہی کی ذات اقدس پر اس کا انحصار ہے، اور قیامت تک رہے گا، اور اب نجات، ترقی، درجات میں سے کسی چیز کا کوئی امکان آپ کی رسالت کے بغیر نہیں ہے۔

اس کے بعد خاکسار نے کہا اب جناب ڈاکٹر شرف الدین اصلاحی اپنا مقالہ پڑھیں گے، مولانا حمید الدین فراہی پر ان کا ایک مبسوط مقالہ شائع ہونے والا ہے اور اس میں ہر قسم کی تحقیقات انھوں نے اکٹھا کی ہیں۔

ڈاکٹر شرف الدین اصلاحی میرے مقالہ کا عنوان ہے "مستشرقین اور اسلام" یہ سمینار کے مرکزی موضوع اسلام اور مستشرقین سے ذرا ہٹ کر ہے، سمینار کے موضوع کا مطلب جہاں تک میں نے سمجھا ہے یہ ہے کہ مستشرقین اسلام کو کس نظر سے دیکھتے ہیں، اور اسلام کے ساتھ ان کا رویہ کیا ہے، جب کہ میں نے اپنے مقالہ میں اس مسئلہ سے بحث کی ہے کہ اسلام مستشرقین کو کس نظر سے دیکھتا ہے،

سب سے پہلے میں موضوع میں شامل الفاظ کی مختصر لغوی اور معنوی تشریح پیش کرتا ہوں، اس سے آیندہ مباحث کو سمجھنے میں مدد ملے گی۔

مستشرق مشتق ہے استشراق سے، جس کا مادہ "شرق" ہے، جو ضد مقصود ہوتا ہے غرب کا، میں نے مقصود ہوتا ہے کہا، اس لیے کہ میرے نزدیک یہ تقسیم و تفریق حقیقی نہیں اعتباری ہے، اور غیر صحتمند رجحانات کی پیداوار ہے، شرق و غرب کے دو باہم متضاد اور اردو میں مستعمل مترادفات مشرق و مغرب ہیں، عربی میں مستشرق ہی نہیں خود اس کا اسم یا مصدر استشراق بھی مولد یعنی نیا اور بعد کی پیداوار ہے، چنانچہ قدیم عربی لغات میں اس مادہ کا باب استفعال سرے سے مفقود ہے، جدید لغات میں یا قدیم لغات کے جدید ایڈیشنوں میں البتہ مستشرق اور استشراق کے الفاظ بطور اسم فاعل اور اسم مصدر کے ملتے ہیں، جن کا استعمال مخصوص بھی ہے اور محدود بھی، استشراق بطور فعل کے ان لغات میں بھی مذکور نہیں ہے، عربی یا اردو لٹریچر میں بھی یہ لفظ زیادہ پرانا نہیں ہے، اور الفاظ پہلے استعمال میں آتے ہیں، اس کے بعد ہی لغات میں جگہ پاتے ہیں، درحقیقت یہ الفاظ ترجمہ یا چربہ ہیں اورینٹلسٹ اور اورینٹلزم کا، جو اورینٹ سے ماخوذ ہیں، انگریزی میں اورینٹ، ایسٹ کا ہم معنی ہے، اہل مغرب نے یہ نام اپنے "ان نام نہاد اسکالروں کو دیا جنھوں نے بزعم ان کے مشرقی علوم و فنون، زبان و ادب اور تہذیب و ثقافت کو جس میں مذہب بھی آجاتا ہے اپنی دلچسپی کا موضوع بنایا اور ان کا خصوصی مطالعہ کرکے براہ راست ان سے واقفیت حاصل کی، عربی میں اس کے لیے کوئی لفظ پہلے سے موجود نہیں تھا اس لیے جب اس کی ضرورت پیش آئی تو انگریزی ہی کی طرز پر الفاظ وضع کر لیے گئے۔

ثلاثی مزید کے ابواب میں سے باب استفعال جس کے وزن پر استشراق بنایا گیا ہے، اس کی ایک خاصیت صیرورۃ اور اتخاذ ہے، جس میں بن جانا، اپنانا، یا حاصل کرنا مفہوم ہوتا ہے مثلاً استحجر الطین، مٹی پتھر بن گئی، استوطن القریۃ، بستی کو اپنا وطن بنا لیا، استفاد فائدہ حاصل کرنا، اسی اصول اور قاعدہ کے تحت جب کسی زمانہ میں کچھ لوگوں نے باہر سے آکر جزیرۃ العرب میں بود و باش اختیار کی اور وقت گذرنے کے ساتھ وہ بھی عرب ہو گئے تو ان کو عرب کے قدیم اور اصلی باشندوں سے ممیز کرنے کے لیے اسی باب استفعال سے کام لے کر ایک لفظ بنایا گیا استعرب، عرب بن گیا، چنانچہ عرب کی قدیم تاریخ میں عرب عاربہ اور عرب مستعربہ کی اصطلاحیں ملتی ہیں، اردو میں ہم اسے اصلی عرب اور نقلی عرب بھی کہہ سکتے ہیں، نئے اور پرانے، بڑے اور چھوٹے سے بھی تعبیر کر سکتے ہیں، اس مسئلہ کی میں نے تحقیق نہیں کی کہ عربی میں مستشرق اور استشراق کا لفظ پہلے پہل کس نے وضع کیا، اس کے واضع خود مستشرقین ہیں، یا ان کے غیر، اگر خود مستشرقین ہیں تو ان سے چوک ہوئی اور اگر غیر ہیں تو ان کا تیر نشانہ پر لگا، استشراق کی

حقیقت اور اس کی تاریخ جن کی نظر میں ہے وہ تسلیم کریں گے کہ یہ نام ان کے لئے انتہائی موزوں ہے، خود یہ نام ان کا راز فاش کرتا ہے، ان کے چہرے سے نقاب اٹھا کر ان کی اصلیت کو ظاہر کرتا ہے، حاصل کلام یہ کہ از روئے عربی زبان استشراق کے معنی ہوئے، بہ تکلف مشرقی بننا اور مستشرق معنی وہ شخص جس نے بہ تکلف مشرقیت اختیار کی، یا مشرقی بنا، اور ظاہر ہے کہ اس فعل کی نسبت کسی مغربی ہی کی طرف ہو سکتی ہے، خود کسی مشرقی کا مشرقی بننا مہمل سی بات ہے،،

مستشرقین کے نام میں بظاہر بڑی معصومیت ہے اور نام ہی پر کیا موقوف ہے ان کے کام کو بھی دیکھیں تو بادی النظر میں اس میں برائی کی بات نظر نہیں آئے گی، آخر اس میں برائی کی کیا بات ہے اگر بیچارے مغربی اسکالر اور مفکرین مشرقی علوم و فنون کی تحصیل و تحقیق میں اپنا وقت صرف کرتے ہیں، وقت ہی نہیں، سرمایہ اور ذہنی صلاحیتیں بھی، وہ کام جو ہمیں کرنا چاہئے بیچارے وہ کر رہے ہیں کیا یہ ان کا احسان نہیں ہے، اہل مشرق پر، سادہ لوح مشرق، سادہ لوح مسلمان ان کا احسان مانتے ہیں لیکن ساتھ ہی ان کو گلہ بھی ہے کہ ع:

مجھ پہ احساں جو نہ کرتے تو یہ احساں ہوتا

اس نے کہ ع ہوئے تم دوست جس کے دشمن اس کا آسماں کیوں ہو

استشراق کی ابتدا کب اور کن حالات میں ہوئی، اس کے پیچھے کیا مقاصد تھے، کس قسم کے افکار نے اس کی طرف توجہ کی، ان کے اپنے حالات و کوائف کیا تھے، اس زمرہ سے تعلق رکھنے والے مختلف اسکالروں کا رویہ اور طرز عمل مشرق بالخصوص اسلام کے ساتھ کیا رہا ہے، ہمدردانہ یا غیر ہمدردانہ حقیقت پسندانہ یا متعصبانہ، جانبدارانہ یا غیر جانبدارانہ یا جارحانہ اور معاندانہ، یہ ایسے سوالات ہیں جن کے متعلق کافی بحث ہو چکی ہے، اور اب بھی کوئی شخص ان کا تاریخی جائزہ لینا چاہے تو اس کی ضرورت یا افادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا، مگر مجھے بالفعل ان سوالات سے

تعرض نہیں کرنا ہے، یہ طویل طویل بحثیں ہیں، جن سے صرف نظر کر کے اصل موضوع کی طرف متوجہ ہوتا ہوں اسلام حق کا پیغام لے کر آیا تو اس کے راستہ میں جو لوگ حائل ہوئے ان میں کفار قریش کے علاوہ یہود و نصاریٰ بھی تھے، یہود و نصاریٰ کی نفسیات بوجوہ اس باب میں کفار قریش سے مختلف تھیں، ان میں نسلی تعصب کے علاوہ مذہبی عصبیت بھی تھی، نسلاً ان کا تعلق حضرت ابراہیمؑ کی دوسری شاخ حضرت اسحاقؑ سے تھا، جبکہ داعیٔ اسلام کا تعلق اس خاندان سے تھا جو حضرت اسماعیلؑ سے چلا، مذہبی اعتبار سے یہود و نصاریٰ پہلے سے حامل کتاب تھے اور اس بات کے منتظر تھے کہ آخری نبی کی بعثت بھی انہی میں ہوگی، خاندانی رقابت کا یہ احساس ان میں اس حد تک غالب تھا کہ انھوں نے قبلہ اور ذبح عظیم کے واقعہ کی اصلیت کو چھپانے کے لیے خود اپنی کتابوں میں تحریفیں کیں، اسلام جب انھیں ایک غالب قوت کی حیثیت سے ابھرتا نظر آیا تو انھوں نے اس کا راستہ روکنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا اور حالات کے تحت ادل بدل کر وہ تمام تدبیریں اختیار کیں جو وہ کر سکتے تھے، انہی تدابیر میں سے ایک تدبیر وہ بھی تھی جسے آج کی زبان اور اصطلاح میں استشراق کا نام دیا جاتا ہے، ظاہر ہے اس کی نسبت اسلام کا رویہ مذمت اور اظہار نکیر ہی ہو سکتا ہے۔

قرآن مجید نے اس زمانہ میں موجود استشراق کی پردہ دری ان الفاظ میں کی ہے:

وَقَالَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا لَا تَسْمَعُوْا	اس قرآن کی باتیں نہ سنو اور اس میں
لِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَالْغَوْا فِیْهِ	گڑبڑ پیدا کرو، شاید تم غالب
لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُوْنَ۔	آجاؤ۔

آج اسرائیل اور بعض باطل پرست فرقے قرآن مجید کے غلط نسخے چھاپ کر پھیلانے کی جو ناپاک کوششیں کر رہے ہیں کیا وہ اس سلسلہ کی کڑی نہیں جس کا ذکر مذکورہ بالا آیت میں کیا گیا ہے۔

اہل کتاب کے ایک گروہ نے یہ حربہ اختیار کیا کہ ان کے آدمی صبح اسلام لائے اور شام کو دائرۂ اسلام سے نکل جاتے کہ اس طرح لوگ اسلام سے برگشتہ ہوں، جس کا ذکر آل عمران کی آیت ۷۲ میں کیا گیا ہے: وَقَالَتْ طَائِفَةٌ مِّنْ أَهْلِ الْكِتَابِ آمِنُوا بِالَّذِي أُنزِلَ عَلَى الَّذِينَ آمَنُوا وَجْهَ النَّهَارِ وَاكْفُرُوا آخِرَهُ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ۔

باطل پرستوں کی ایک چال یہ بھی ہوتی ہے کہ کچھ دو اور کچھ لو کا معاملہ کر کے بیچ کا راستہ اختیار کریں، لیکن حق کے یہ قابل قبول نہیں ہے، آنحضرتؐ کے زمانہ میں بھی یہ حکمت عملی موجود تھی جس کی نشان دہی قرآن مجید نے سورۂ نون کی آیت ۹ میں کی ہے:

وَدُّوا لَوْ تُدْهِنُ فَيُدْهِنُونَ　وہ چاہتے ہیں کہ کچھ تم اپنے موقف سے ہٹو تو وہ بھی ہٹیں۔

یہ رجحان اس زمانہ میں ہی نہیں تھا بلکہ آج کے استشراق میں بھی موجود ہے، مسلم کرسچین ڈائیلاگ کے عنوان سے آج جو کوششیں ہو رہی ہیں ان کا مقصد اس کے سوا اور کیا ہے کہ بیچ کی راہ نکال کر دفع الوقتی کی جائے، جبکہ اسلام اس کو پسند نہیں کرتا، وہ صاف صاف کہتا ہے کہ ادْخُلُوا فِي السِّلْمِ كَافَّةً۔ اس کے نزدیک دو ہی راستے ہیں، اسلام یا کفر، أَفَتُؤْمِنُونَ بِبَعْضِ الْكِتَابِ وَتَكْفُرُونَ بِبَعْضٍ کی حکمت عملی اس کے نزدیک کفر ہی کی ایک صورت ہے، سورۂ بقرہ کی آیت ۸۵ میں اس طرز عمل کی نشاندہی کر کے صرف دنیوی ذلت اور عذاب آخرت کی دھمکی دی گئی ہے، لیکن سورۂ نساء کی آیت ۱۵۰ میں اس روش کو حقیقی کفر سے تعبیر کیا گیا ہے:

وَيَقُولُونَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَنَكْفُرُ　اور وہ کہتے ہیں بعض باتوں کو ہم مانیں گے

بِبَعْضٍ وَيُرِيدُونَ أَن يَتَّخِذُوا　اور بعض کا انکار کریں گے، اور وہ چاہتے

بَيْنَ ذَٰلِكَ سَبِيلًا۔ أُولَٰئِكَ　ہیں کہ اس کے درمیان کا راستہ اختیار کریں

هُمُ الْكَافِرُونَ حَقًّا۔　یہی لوگ حقیقی معنوں میں کافر ہیں۔

قرآن مجید کی یہ چند آیات جو اوپر بیان کی گئیں ان کے آئینہ میں ہم آج کے مستشرقین اور استشراق کا چہرہ برافگندہ نقاب دیکھ سکتے ہیں اور اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اسلام ان کے بارہ میں کیا رائے رکھتا ہے، قرآن واشگاف الفاظ میں یہود و نصاریٰ کے ساتھ ربط و تعلق قائم کرنے سے منع کرتا ہے، اور ایسے لوگوں کو جو ان کے ساتھ دوستی رکھتے ہیں ان کو ان ہی میں شمار کرتا ہے، سورۂ مائدہ کی آیت ۵۱ میں کس قدر دو ٹوک انداز میں اس کی صراحت ہے: يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُودَ وَالنَّصَارَىٰ أَوْلِيَاءَ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ وَمَن يَتَوَلَّهُم مِّنكُمْ فَإِنَّهُ مِنْهُمْ إِنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ۔

عصر حاضر کے مستشرقین یہود و نصاریٰ نہیں تو اور کون ہیں؟ لیکن یاللعجب کس قدر تعجب کا مقام ہے کہ آج مسلمانوں نے انہی یہود و نصاریٰ کے ساتھ مساویانہ حیثیت سے رسم و راہ رکھنا تو ایک طرف ان کو استاد کا درجہ دے کر اپنے دل و دماغ کی زمام کار ان کے ہاتھ میں دے رکھی ہے، اسلام اور مسلمانوں سے مستشرقین اور استشراق کے تعلق کے مختلف ادوار ہیں، ایک زمانہ میں انھوں نے مسلمانوں سے مختلف دنیوی علوم سیکھے، اس میں استادی کا درجہ حاصل کرنے کے بعد انھوں نے عربی اور اسلامی علوم کی طرف توجہ کی اور بڑی ہوشیاری سے آہستہ آہستہ ان کے بھی امام بن گئے اور نوبت بایں جا رسید کہ آج کسی کو طبیعی اور سائنسی علوم میں ہی نہیں، عربی اور اسلامیات میں سند فضیلت لینی ہوتی ہے تو وہ یورپ اور امریکہ کی ان جامعات کا رخ کرتا ہے، جہاں نام نہاد اسکالر دام تزویر بچھائے دانہ ڈال کر شکار کی گھات میں بیٹھے ہیں، کیا ان کا مقصد واقعی مسلمان نوجوانوں کو عربی اور اسلامیات پڑھا کر اسلام اور ملت اسلامیہ کی خدمت کرنا ہے؟ پورے پورے شعبے انھوں نے اس لیے کھول رکھے ہیں کہ مسلمان ذہن تیار ہوں، اسکالرشپ میں بڑی بڑی رقمیں

وہ اس لیے خرچ کرتے ہیں کہ مسلمانوں میں علماء امتی کانبیاء بنی اسرائیل پیدا ہوں؟ کوئی ہوشمند ایماندار آدمی اس کا جواب اثبات میں نہیں دے سکتا۔

استشراق کی تاریخ یہاں پہونچ کر ایک نیا موڑ مڑ چکی ہے، وہ کام جو ایک صدی پہلے عیسائی مبلغین اور مستشرقین کر رہے تھے، اب اس کام کے لیے انھوں نے مسلمانوں میں سے آدمی تیار کر دیے ہیں، اقبال کا مصرع یاد آتا ہے، انھوں نے ہمارے شاندار ماضی کے لیے کہا تھا ع پاسباں مل گئے کعبہ کو صنم خانے سے۔

آج صنم خانہ، کعبہ سے پاسبان حاصل کر رہا ہے، پہلے اس طرح کی اکا دکا مثالیں تھیں، آہستہ آہستہ ان میں اضافہ ہوتے ہوتے ان کی تعداد اتنی ہوگئی ہے کہ ہم اسے استشراق کے ایک علیحدہ دور سے تعبیر کر سکتے ہیں، میں نے بہت سوچا کہ استشراق کے ان علمبرداروں کو کیا نام دیا جائے؟ مستشرقین اور استشراق کی جو صحیح تعریف ہم نے آغاز کلام میں متعین کی تھی وہ ان پر صادق نہیں آتی، بعض لکھنے والوں نے ان کے لیے مستغربین لکھا ہے، مگر اس کی موزونیت میں مجھے کلام ہے، میں لفظیات اور اصطلاحات کے ماہرین کو دعوت دیتا ہوں کہ وہ اس کے لیے کوئی مناسب لفظ تجویز کریں۔

شیطان اس دنیا میں انسان کو گمراہ کرنے کا مشن لے کر آیا تھا، اس کو جب انسانوں میں ہی ایسے شاگرد مل گئے جو اس کے مشن کو اس سے زیادہ مستعدی کے ساتھ تکمیل کرنے لگے تو وہ فارغ ہوگیا، اسی طرح ہمارے مستشرقین بھی اب فارغ ہو چکے ہیں، کچھ وقت گذرنے کے بعد ان کا نام صرف تاریخ میں باقی رہ جائے گا، لیکن اسلام رہے گا اور اسے مستشرقین کی جگہ اس نئی مخلوق سے واسطہ ہوگا جو کام انہی کا کرے گی، لیکن اس کا نام کچھ اور ہوگا، اور یہ مشیت الٰہی ہے، جو لوگ اسلام کے نام لیوا ہیں، دل سے اسلام کی حقانیت کے قائل ہیں وہ خبردار ہو جائیں

وما علینا الا البلاغ۔

اس مقالہ کے ختم ہونے کے بعد خاکسار نے جناب سید سیاح الدین کاکاخیل کو یہ کہہ کر اپنا مقالہ پڑھنے کی زحمت دی کہ وہ مدرسہ اشاعت العلوم جامع مسجد ہبل آباد کے مہتمم اور صدر مدرس ہیں اور اسی کے ساتھ پاکستان کی اسلامی نظریاتی کونسل کے ایک اہم رکن ہیں، جس موثر انداز میں وہ اپنا مقالہ پڑھیں گے اس سے سامعین ضرور متاثر ہوں گے۔

جناب مولانا سید سیاح الدین کاکاخیل صاحب: حمد رب العالمین اور صلوٰۃ و سلام بر سید المرسلین کے بعد عرض ہے کہ فرانسیسی ڈاکٹر گستاؤلی بان کی کتاب 'تمدن عرب' ایک مشہور کتاب ہے، میں نے اکثر علمی مقالات و مضامین میں اس کے حوالے پڑھے تو ذہن پر یہ اثر تھا کہ یہ ایک نہایت عمدہ تحقیقی تصنیف ہوگی، جس میں مصنف نے پوری فراخ دلی کے ساتھ اور کسی قسم کے تعصب کے بغیر تاریخی حقائق بیان کیے ہوں گے، اس لیے عرصہ سے شوق تھا کہ میں اس کتاب کا مطالعہ کرکے علمی استفادہ کروں، چنانچہ میں نے اس کا اردو ترجمہ حاصل کیا، جو شمس العلماء مولوی سید علی بلگرامی نے کیا ہے اور جو بارہا شایع ہوا ہے، اور پاکستان میں اس کو مقبول اکیڈمی لاہور نے اشرف پریس لاہور سے ۱۹۶۰ء میں طبع کرکے شایع کیا ہے، اس کا مطالعہ شروع کیا، صفحہ ۱۷۷ سے جہاں اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات زندگی تحریر کیے ہیں اور ان پر تبصرہ کیا ہے پڑھ کر دل کو انتہائی صدمہ ہوا، اور احساس یہ ہوا کہ شاید یہ ساری کتاب اسی نقطۂ نظر سے لکھی گئی ہے کہ تاریخی اور علمی تحقیق و تدقیق کے عنوان سے پوری تفصیل کے ساتھ دلچسپ انداز میں مسلمانوں کی ترقیوں کا ذکر کرکے لوگوں کے اذہان کو مسحور کیا جائے اور ان کو یہ تاثر دیا جائے کہ مصنف ایک بہت بڑا فراخ دل اور غیر متعصب محقق ہے، اور وہ جو کچھ لکھتا ہے پوری تحقیق کے بعد عالمانہ انداز میں ہر قسم کی تنگ دلی اور تعصب سے بری ہو کر لکھتا ہے

اور یہ تاثر دیئے اور قلوب و اذہان کو معتقد بنا دینے کے بعد جو زہر افشانی اور خبث نفس کا مظاہرہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مقدس کے بارے میں کر سکتا ہے وہ ایک خاص انداز سے کرے گا اور مطالعہ کرنے والے کے دماغ کو مسموم کر کے اس میں ایسے خیالات بھر دے گا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں عقیدت باقی نہیں رہ سکے گی، اور جب مسلمانوں کو اس ذات اقدس کے بارے میں بدگمان کر دیا جائے تو پھر ان کا دین و ایمان کہاں باقی رہے گا، اور پھر آگے جا کر مسلمانوں کے تہذیب و تمدن کی ترقیوں کی جتنی بھی تعریف کی جائے وہ سب فضول و بے کار ہو گی،

اس مطالعہ کے بعد دل کو جو صدمہ پہونچا میں نے بعض احباب سے اس کا ذکر کیا تو مجھے بتایا گیا کہ علامہ شبلیؒ نے ان ساری باتوں کی تردید کی ہے، اگر میں نے ابھی تک اس کا مطالعہ نہیں کیا، میں کوشش کرتا ہوں کہ وہ حاصل کر دوں۔

بہرحال لی بان نے جو کچھ لکھا ہے یا دوسرے مستشرقین جو کچھ اپنی کتابوں میں اس قسم کے خرافات اور زہریلے مضامین لکھتے ہیں ان سے تو ہمیں کوئی شکایت اس لیے نہیں کہ ان سے کسی خیر کی توقع رکھنا ہی فضول ہے اور یہ تصور کرنا کہ وہ واقعۃً غیر متعصب اور حقیقت شناس و حقیقت پسند بن کر صحیح واقعات پیش کریں گے اور صحیح نتائج اخذ کر کے بیان کریں گے' ناممکن ہے' یہ عقربی نیش زنی تو ان کی طبیعتوں کا تقاضا ہے اور وہ کبھی بھی اور کہیں بھی اس سے رکیں گے نہیں، لیکن مجھے بار بار حیرانی اس پر ہوتی ہے کہ سید علی بلگرامی نے اس کا اردو ترجمہ بڑے اہتمام اور دیدہ ریزی سے کیا، جیسا کہ وہ مقدمہ میں اس کا تفصیلی ذکر کرتا ہے، ٹائٹل ہی پر کتاب کے نام کے ساتھ یہ بھی تصریح ہے "مع توضیحات اور حواشی اردو میں ترجمہ کیا" اور واقعۃً کتاب میں مترجم نے جگہ جگہ توضیحات بھی کی ہیں، طویل حاشیے بھی لکھے ہیں، مگر جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی کے بارے میں ان خرافات اور لغویات کا ترجمہ کر کے اس کو یہ خیال نہیں آیا کہ حاشیہ پر

اپنی طرف سے ان کی مفصل و مدلل تردید کی جائے، اور لی بان کے ان گستاخانہ کلمات کے جواب میں تحقیقی طور پر اس قدر لکھا جائے کہ لی بان کی ایسی دل آزار عبارتیں پڑھنے والے مسلمان کا دل اگر ان کو پڑھ کر زخمی ہوا ہے تو مترجم کا وہ جواب اس زخم کے اندمال کے لیے مرہم بن سکے اور جو صدمہ اس کو پہونچا ہو اس کی تلافی اور تسکین کا سامان تو ہو جائے اور اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحیح حالات زندگی اور آپ کی سیرت طیبہ کے واقعات سے کوئی ناواقف نام مسلمان یا کوئی غیر مسلم اس کو پڑھ کر شکوک و شبہات میں مبتلا ہو اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پاک کے بارے میں غلط تصور قائم ہو تو تردیدی حواشی پڑھنے کے بعد اس کے شک و شبہہ کا پورا پورا ازالہ ہو اور غلط تصورات کے بجائے وہ حقیقت حال کو سمجھ کر صحیح تصور قائم کرے، لیبان نے جو کچھ لکھا ہے وہ نری جہالت اور استشراقی تعصب کا بدترین مظاہرہ ہے، ان غیر تاریخی اور حقیقت سے کوسوں دور خرافات کو لکھ کر وہ جو مقصد حاصل کرنا چاہتا تھا' نہ صرف ایک مسلمان محقق کی حیثیت سے جس کے عقیدوں کے خلاف باتیں لکھی گئی تھیں ایک عام حقیقت شناس و حقیقت پسند منصف مزاج مورخ کی حیثیت سے بھی جناب سید علی بلگرامی کا یہ فریضہ تھا، مگر افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ انھوں نے اس قدر اہم فریضہ سے غفلت کیوں برتی اور اس قدر لغویات کا ترجمہ کرتے وقت ان کو بالکل خیال نہیں آیا کہ ان پر گرفت نہ کرنا اور خاموش گذرنا ایک علمی خیانت اور مطالعہ کرنے والے ناواقف لوگوں پر ظلم ہے، بارہا یہ کتاب مترجم کی وفات کے بعد بھی شایع ہوئی، لیکن کسی ناشر نے مسلمان ہونے کے باوجود اس طرف توجہ نہیں کی، اگر مترجم سے یہ فروگذاشت ہوئی تھی' وجہ اس کی جو کچھ بھی ہو تو بعد کے ناشرین کتاب کو تو چاہیے تھا کہ وہ اس کی تلافی کرتے اور کسی اچھے محقق عالم سے ان کی تردید لکھوا کر ساتھ ہی شائع کرتے، اہل علم کے اس عظیم مجمع میں پورے درد دل کے ساتھ اپنی یہ درخواست پیش کرتا ہوں کہ وہ اس حصۂ کتاب کی تمام زہریلی اور گستاخانہ عبارتوں کی مدلل

تردید لکھ کر کتاب کے ناشرین کو مجبور کریں کہ اگر وہ کتاب میں سے اس حصہ کا نکالنا اپنے خیال میں خیانت سمجھتے ہوں تو اس کے ساتھ یہ تردید اور شکوک و شبہات کا ازالہ بھی ضرور شایع کریں، اور علمی رسائل میں وہ تردیدی مضمون بار بار شایع ہو تا کہ بدقسمتی سے جن لوگوں نے یہ کتاب پڑھی ہے اور اس حصۂ کتاب کو پڑھ کر ان کے اذہان کچھ ماؤف ہوئے ہوں تو وہ اس تردیدی مضمون کے مطالعہ کے بعد اپنے اذہان کو صاف کر سکیں۔

انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کا اردو ترجمہ دائرۃ المعارف الاسلامیہ کے نام سے پنجاب یونیورسٹی لاہور میں عرصۂ دراز سے ہو رہا ہے اور قسط وار شایع ہوتا رہتا ہے، اس میں بعض مقالات مستشرقین اور یہودی فضلاء کے لکھے ہوئے ہیں اور ان میں بھی وہ علمی خیانت سے کام لے کر اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں ڈنک مارتے رہتے ہیں، اور اس انداز سے کہ بظاہر وہ ایک معمولی سا اشارہ کر جاتے ہیں کہ جو شخص بھی اس کو پڑھ کر اس کو ایک علمی حقیقت سمجھ کر جذب کر لے تو پھر آگے سوچتے ہوئے اس کا ذہن ایک غلط لائن پر پڑ جاتا ہے، اور بظاہر معمولی طور پر ذہن کا کانٹا بدل دینے کے بعد وہ مطالعہ کرنے والے کو ایک ایسی لائن پر لگا کر آگے چلاتے ہیں کہ وہ منزل مقصود سے بہت دور نکل جاتا ہے تو ضرورت تھی کہ ترجمہ کے ساتھ ساتھ ایسے زہریلے کانٹوں کی نشاندہی بھی کی جاتی اور اذہان سے ان کے اثرات نکالنے کی بھی علمی کوشش ہوتی، یہ بات دراصل لاہور میں کہنے کی تھی، مگر پہلی دفعہ منتخب اہل علم کا مجمع مجھے یہاں ملا ہے، اس لیے اگر اس ندوۂ علمیہ اور محفل فضلاء کی طرف سے کوئی ایسی قرارداد ہو جائے جو اس دار الترجمہ کے ذمہ داروں کو متوجہ کر سکے تو شاید وہ زیادہ موثر ہوگا، اور ان کو متوجہ کر سکے گا، اگرچہ میں کوشش کروں گا کہ اپنی آواز وہاں بھی پہونچا کر ترجمہ کرنے والے حضرات کو اس طرف متوجہ کر سکوں، یہ استشراق ایک بہت بڑا فتنہ ہے جس کے مضر اثرات سے ہر میدان میں نئی نسل کے مسلمان نوجوانوں کو بچانا ضروری ہے، الاستاذ یوسف القرضاوی نے بالکل درست

فرمایا ہے کہ مستشرقین سے بڑھ کر خطرہ ان کے شاگرد مستغربین کا خطرہ ہے، جو مسلمانوں کے لباس میں ملبوس ہو کر ہمارے تعلیمی اداروں میں ان مستشرقین کے نظریات و خیالات اور تحریفات و خرافات پھیلاتے اور نوجوان طلبہ کے ذہن مسموم کرتے ہیں۔ اس زہر ہلاہل کا تریاق مہیا کرنا اس وقت علم دین اور دین اسلام کی بہت بڑی اور نہایت ضروری خدمت ہے، اللہ تعالیٰ ہمیں توفیق عطا فرمائے

(باقی)

تاریخ اسلام حصہ اول تا چہارم

از مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی مرحوم

سلسلۂ سیرۃ النبی اور سلسلۂ سیر الصحابہ کی طرح دار المصنفین کا ایک اہم سلسلہ تاریخ اسلام بھی ہے جو سولہ جلدوں پر مشتمل ہے، اس سلسلہ کی مندرجہ ذیل چار جلدوں کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی اور اب تک متعدد ایڈیشن چھپ چکے ہیں، ہندوستان و پاکستان کی مختلف یونیورسٹیوں نے ان کو اسلامی تاریخ، اسلامی تہذیب و ثقافت کے نصاب میں داخل کیا ہے، بعض نے ان کو مطالعہ کی کتابوں میں رکھا، اور تاریخ اسلام کے عام طلبہ بھی سہولت کے خیال سے ان سے برابر فائدہ اٹھاتے ہیں،

ان چاروں جلدوں میں آغاز اسلام سے خلافت عباسیہ کے خاتمہ تک کئی صدیوں کے حالات بیان کیے گئے ہیں اور یہ عہد رسالت، خلافت راشدہ اور اموی و عباسی حکومتوں کی مکمل اور جامع مذہبی سیاسی، تمدنی اور علمی تاریخ ہے، چوتھی جلد میں جو خلافت عباسیہ کے زوال اور دوسری نئی نئی حکومتوں کے قیام اور بغداد میں ان کے تسلط و اقتدار کے حالات پر مشتمل ہے، اتابکی اور ایوبی حکومتوں کے صلیبی جنگ میں مجاہدانہ کارناموں اور بیت المقدس کی فتح کی تفصیل پیش کی گئی ہے،

قیمت حصہ اول ۱۷/۰۰، حصہ دوم ۱۵/۰۰، حصہ سوم ۱۸/۰۰، حصہ چہارم ۱۹/۰۰

اسی سلسلہ میں شام کے مشہور فاضل محمد کرد علی کی تصنیف "اسلام اور عربی تمدن" بھی داخل ہے، اس کا سلیس و شگفتہ اردو ترجمہ بھی مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی مرحوم ہی نے کیا ہے، اس میں اسلام اور اسلامی تمدن و تہذیب پر علمائے مغرب کے اعتراضات کا بہت مدلل جواب دیا گیا ہے، قیمت ۱۷/-

مطبوعات جدیدہ

مطالعۂ قرآن کے اصول ومبادی از۔ مولانا سید ابو الحسن علی ندوی متوسط تقطیع، کاغذ کتابت وطباعت عمدہ، صفحات ۱۹۶ مجلد مع گرد پوش قیمت بارہ ۱۲ روپے۔ پتہ۔ مکتبہ اسلام، گوئن روڈ، لکھنؤ۔

مولانا سید ابو الحسن علی ندوی کو قرآن مجید کے مطالعہ سے بڑا شغف ہے وہ مدتوں دار العلوم ندوۃ العلما میں تفسیر وادب کے استاذ رہ چکے ہیں، اس زمانہ میں انھوں نے درس کے مالوف اور عادی طریقہ کے علاوہ اپنے خاص ذوق کی بنا پر طلبہ کے لیے مضامین کا ایک سلسلہ شروع کیا تھا تاکہ انھیں قرآن سے دلچسپی بھی ہو اور وہ اس کی عظمت واہمیت کے علاوہ اس کی روح اور مقصد سے بھی آشنا ہوں مگر اس دور کے بعد مولانا اپنے گوناگوں علمی اشتغال اور تبلیغی سفروں میں ایسے منہمک رہے کہ ان مضامین کی جانب کوئی توجہ نہ کر سکے اور ان کا مبیضہ بھی غائب ہو گیا، اب یہ کسی طرح دستیاب ہوا تو بہت اہتمام سے شائع کیا گیا ہے، یہ تقریباً ایک درجن مضامین کا مجموعہ ہے پہلے مضمون میں قرآن مجید کا تعارف اسی بیے کرایا ہے اس میں اس پر زیادہ زور دیا ہے کہ اللہ کی جانب سے ہونے کی وجہ سے قرآن کا علم قطعی اور غیر مشتبہ ہے، ایک مضمون میں قرآن مجید کی قدیم آسمانی صحیفوں پر فوقیت اور ان سے اس کا فرق دکھایا ہے، اس ضمن میں حضرت یوسفؑ کے قصہ کو مثالاً پیش کر کے تورات کے مقابلہ میں قرآن کے بیان کا حسن اور اسکے اسلوب کی دلآویزی واضح کی ہے۔ مولانا نے قرآن کے اعجاز پر مختلف حیثیتوں سے اچھی بحث کی ہے۔

اس سلسلہ میں اس کی مختلف پیشین گوئیوں پر اجمالاً مگر غلبۂ روم کی پیشین گوئی پر تفصیلاً گفتگو کی ہے جو پرازمعلومات ہے، قرآن کے معجزۂ ہدایت وانقلاب پر بھی اچھی بحث ہے، ایک مضمون میں قرآن مجید کی عظمت اس حیثیت سے دکھائی ہے کہ اس سے پہلے کے آسمانی صحیفے تحریف وتبدل کے علاوہ تلف اور برباد بھی ہوتے رہے ہیں جب کہ قرآن مجید کا ایک ایک نقطہ اور شوشہ محفوظ ہے اس سلسلہ میں تورات کی تین ۳ بار گمشدگی اور اناجیل کے غیر معتبر ہونے کا ذکر خود یہودی وعیسائی مصنفین کے حوالہ سے کیا ہے، قرآن سے استفادہ میں جو چیزیں مانع یا معاون ہیں ان کا بھی دو مضامین میں ذکر ہے، آخر میں صحابہ کرام، ائمہ عظام اور صوفیائے کرام کی تلاوت، مطالعہ اور تدبر قرآن سے شغف کے موثر اور شوق انگیز حالات بیان کئے ہیں، یہ مضامین مولانا کے ابتدائی دور کی یادگار ہیں، ان میں ترمیم واضافہ کا انھیں احساس تھا، مگر اس کے لیے ان جیسے مشغول شخص کے پاس وقت نہ تھا، تاہم یہ علمی تبرک طلبہ قرآن کے لئے نعمت غیر مترقبہ ہے،

سید نجیب اشرف ندوی شخصیت اور کارنامے مرتبہ جناب ریاست علی تاج تقطیع متوسط، کاغذ معمولی کتابت وطباعت بہتر صفحات ۲۰۰ قیمت تیس ۳۰ روپے پتے۔ اردو گھر راؤز اوینیو نیو دہلی ۲، معتمد ادبی مجلس کوٹلہ شیخان، کریم نگر حیدرآباد ۵۰۵۰۰۱۔

جناب سید نجیب اشرف ندوی مرحوم دار المصنفین کے ابتدائی دور کے لائق رفیق تھے، ان میں غیر معمولی علمی صلاحیتیں تھیں، اس لئے کم سنی ہی میں مقدمہ رقعات عالمگیر اور رقعات عالمگیر جیسی بلند پایہ کتابیں لکھیں جن کو دیکھ کر ارباب علم ان کی جانب متوجہ ہوگئے مگر بمبئی جانے کے بعد درس وتدریس کے مشاغل اور انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے انتظامی امور کی وجہ سے تصنیف وتالیف کا کام خاطر خواہ طور پر نہیں کر سکے، یہ کتاب سات ابواب پر مشتمل ہے، پہلے باب میں نجیب صاحب کے ترک موالات اور آزادی کی تحریکوں سے وابستہ ہونے کا ذکر ہے، دوسرے باب میں ان کے خاندانی

حالات، تعلیم، مضمون نگاری کی ابتدا، اولاد و وفات کا ذکر ہے اور ان کے متعلق اہل علم کے تاثرات اور شعرا کے باتی اشعار درج ہیں، تیسرے باب میں انکی سیرت و شخصیت کے مختلف جلوے دکھائے گئے ہیں اس سے نجیب صاحب کی شرافت، مقبولیت و ہر دلعزیزی کا اندازہ ہوتا ہے، وہ نہایت شگفتہ مزاج اور باغ و بہار شخص تھے مصنف نے اس کے کچھ دلچسپ نمونے دیے ہیں، چوتھے باب میں انکی تصنیفات، تراجم اور مضامین کی مکمل فہرست اور علمی و ادبی زندگی کے تین ادوار کا ذکر ہے، پہلے دور میں رفیق دار المصنفین کی حیثیت سے ان کی کتابوں اور معارف میں شایع شدہ مضامین پر ریویو اور دوسری نوعیت کے مضامین پر مبسوط تبصرہ ہے، دوسرے میں اردو کے پروفیسر اور تیسرے میں ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر کی حیثیت سے انکی تصنیف لغات گجری، نوائے ادب اور دوسرے رسالوں میں چھپے مضامین پر بحث و تبصرہ ہے اور ضمناً انجمن اسلام کا تعارف اور ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے اغراض و خدمات بیان کئے ہیں، پانچویں باب میں نجیب صاحب کے چند خطوط درج ہیں، چھٹے میں ان کے نظریۂ زبان و ادب پر بحث ہے اور ساتویں میں انکے اسلوب کی خصوصیات دکھائی ہیں اور طرز نگارش کے نمونے بھی نقل کئے ہیں، یہ کتاب وہ مقالہ ہے جو ایم۔ اے فائنل کیلئے لکھا گیا تھا، گو اس سے نجیب صاحب پر کام کرنے والوں کو آئندہ مدد ملے گی لیکن جو لوگ انکو اچھی طرح جانتے ہیں انھیں اس کتاب کے پڑھنے کے بعد پوری طرح تشفی نہیں ہو سکتی ہے، ان کی نظر میں یہ کتاب انکی پوری زندگی پر حاوی نہیں ہے بلکہ یہ انکی زندگی کا ایک سرسری خاکہ ہے نجیب صاحب کے مضمون "پان کی کہانی" کا کئی جگہ ذکر ہے، ص ۳۰ سے ظاہر ہوتا ہے کہ مصنف اسکے سن اشاعت کی تعیین سے قاصر ہیں لیکن ص ۱۰۱ پر اس کا سن اشاعت ۱۹۳۰ء اور ص ۲۵۵ پر ۱۹۳۰ء لکھا ہے ایک جگہ لکھتے ہیں "پھر ندوہ، شبلی اکیڈمی اور دار المصنفین سے بالالتزام ...." (ص ۱۵۱) اس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ شبلی اکیڈمی اور دار المصنفین کو دو ادارے سمجھتے ہیں، ایک جگہ جناب شاہ معین الدین احمد ندوی مرحوم کی جانب "تاریخ ہند" کو منسوب کیا ہے، حالانکہ انکی کتاب "تاریخ اسلام" ہے جناب سید صباح الدین عبد الرحمن صاحب کو محمد بن قاسم کا مصنف لکھا ہے یہ غلط ہے ص ۲۵۸ پر ۱۹۳۰ء تا ۱۹۵۵ء تقریباً پندرہ سال لکھا ہے جو غالباً کتابت کی غلطی ہو گی، ایک جگہ بلوغ المرام کو بلاغ المرام لکھا ہے (ص ۲۹) نجیب صاحب کے اہم تلامذہ میں عبد الرزاق قریشی مرحوم کا نام چھوٹ گیا ہے اور ان سے بہت کم درجہ کے لوگوں کا ذکر ہے، ص ۱۴۰ پر لکھتے ہیں "نجیب صاحب نے شہزادہ دارا شکوہ کی کتاب کا نام سفینۃ الاولیا بتایا ہے جبکہ بقول بعضے سفینۃ الاصفیا ہے، حالانکہ نجیب صاحب نے صحیح لکھا ہے دارا شکوہ کی سفینۃ الاصفیا نام کی کوئی کتاب ابھی تک دریافت نہیں ہو سکی ہے البتہ اسکی ایک اور کتاب کا نام سکینۃ الاولیا ہے، انعامی مضمون اردو کا سب سے بڑا انشا پرداز کون ہے کے متعلق تحریر کیا ہے کہ نجیب صاحب کے مضمون کو انعام کا مستحق قرار دیا، یہ خلاف واقعہ ہے انعام کا مستحق ...

"ض"

جلد ۱۳۰ ماہ شوال المکرم ۱۴۰۲ھ مطابق ماہ اگست ۱۹۸۲ء عدد ۲

مضامین